www.urducouncil.nic.in
اگست 2015، قیمت: -/10 روپے

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly **BACHON KI DUNIYA**, New Delhi

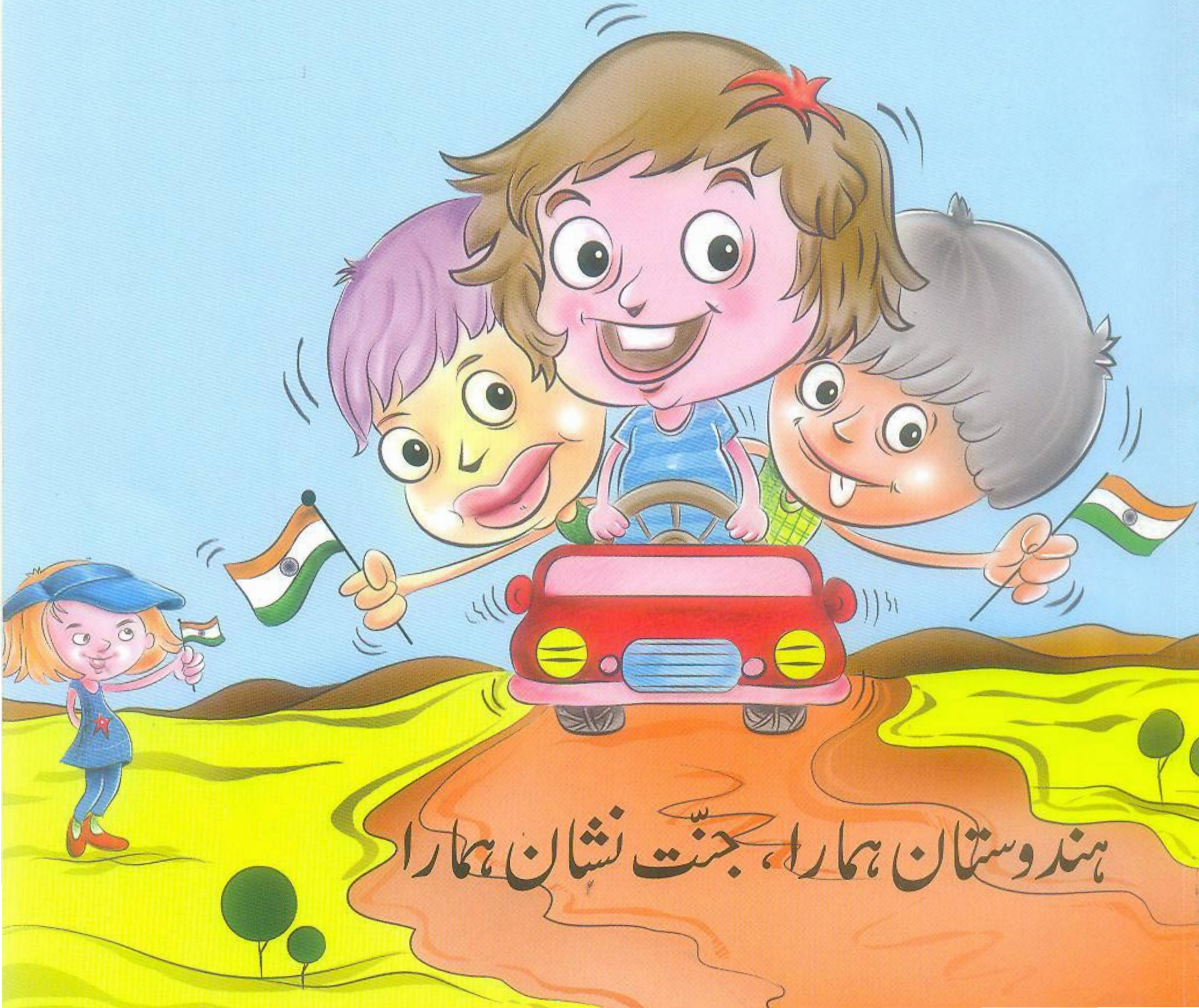

ہندوستان ہمارا، جنّت نشان ہمارا

بچوں کی دنیا

جلد:3 شمارہ:8 اگست 2015

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000

شعبہ ادارت:11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10روپے، سالانہ/100روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

’بچوں کی دنیا‘ کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت:

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی 110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی بات	مدیر	04
نظم	ہندوستان والے	حیدر بیابانی	05
تمثیلی مشاعرہ	پھلوں کا مشاعرہ	خاور نقیب	06
کہانیاں	سنہری فیصلہ	ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان	18
	نیک شرارت	عابد علی خاں	21
	لالچ بری بلا / دیر نہ ہو جائے	محمد فروغ جعفری	24
	گھنٹی۔۔۔ بجے نہ بجے	بابو آر کے	28
	پڑھنے والی ٹیچر	مبین احمد انصاری	32
	نئی روشنی	نصرت جہاں	35
مضمون	جانے انجانے کیڑے	شمس الاسلام فاروقی	38
ننھے فنکار	موتی ہے بیٹیاں	نازمین اکرم خان	43
	بھوتوں کی دنیا کی سیر	ارشد حسین	44
	جانور اور انسان	خان ندیم عبدالقیوم	48
	رم جھم رم جھم سا موسم	عبدالرحیم نشتر	50
قسطوار ناول	الٹا درخت	کرشن چندر	51
کامکس کہانی	علی بابا اور چالیس چور	ادارہ	57

آپس کی باتیں

پندرہ اگست! ہمارا یوم آزادی! یعنی وہ دن جب آج سے اڑسٹھ سال پہلے ہمیں انگریزوں کی غلامی سے آزادی ملی تھی۔

کہنے کو تو دوستو یہ محض ایک تاریخ ہے۔ سال کے باقی دنوں جیسا ہی ایک عام دن۔ لیکن اس عام دن کی ایک خاص اہمیت ہے۔ ایک خاص تاریخ ہے اور یہ تاریخ جڑی ہوئی ہے بدیسی حکمرانوں کی تھوپی ہوئی اس غلامی سے جس کا ہمارے ملک کو پہلی مرتبہ سامنا کرنا پڑا تھا۔ انگریز پہلے غیر ملکی تھے جنھوں نے اس مقصد سے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کی کہ لوٹ کھسوٹ مچا کر ہماری دولت اپنے دیس انگلینڈ لے جائیں۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا جب باہر کے لوگ ہندوستان آئے ہوں۔ ہزاروں سال پہلے آریہ آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یونانی آئے لیکن ساری دنیا پر حکومت کرنے کا ان کے رہنما سکندر اعظم کا خواب ہندوستان پر حملہ کرتے ہی ٹوٹ گیا اور اسے واپس اپنے ملک جانا پڑا۔ مسلمان بھی باہر سے حملہ آور بن کر ہندوستان آئے لیکن بعد میں یہ ملک انھیں اتنا پسند آیا کہ ہمیشہ کے لیے یہیں بس گئے اور یہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ مل جل کر ایک ایسی شاندار ملی جلی تہذیب کی بنیاد انھوں نے ڈالی جسے آج ہم ہندوستانیت کہتے ہیں۔

خیر، یہ سب تاریخ کی باتیں ہیں جنھیں آپ اپنی کلاسوں میں آگے چل کر تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے۔ ہمارا مقصد غلامی کے اس دور کو یاد کرنا ہے جس کا احساس آج کی نسل کو مشکل سے ہی ہوگا۔ اور ہوگا بھی کیسے؟ ہم آزادی کے دور میں پیدا ہوئے۔ ہم میں سے اکثر کے والدین نے بھی آزادی کے ہی دور میں جنم لیا۔ اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ ہم غلامی کے درد اور اس کی ذلت کو اس گہرائی کے ساتھ محسوس نہیں کر سکتے جس گہرائی کے ساتھ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے کیا تھا یا جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، ولبھ بھائی پٹیل، سروجنی نائڈو، خان عبدالغفار خان اور حسرت موہانی جیسی بڑی ہستیوں نے کیا تھا اور اپنی بے مثال قربانیوں کی بدولت آنے والی نسلوں کو غلامی سے نجات دلائی تھی۔

کبھی اپنے دادا یا نانا جان سے پوچھ کر دیکھیے، وہ آپ کو بتائیں گے کہ کس طرح انگریز ہم کروڑوں ہندوستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیسے حکومت کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبا دیا جاتا تھا۔ کس طرح آزادی کا نعرہ لگانے والوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔ کالے پانی کی سزا دی جاتی تھی۔ پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ ان سبھی باتوں کو ہم اپنے تصور میں لائیں تبھی تھوڑا بہت سمجھ سکیں گے کہ غلامی دراصل کتنی بڑی ذلت ہے اور آزادی کتنی بڑی نعمت!

آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ وطن کی آزادی کو ہرگز آنچ نہیں آنے دیں گے۔ خود مٹ جائیں گے مگر اپنی آزادی کو نہیں مٹنے دیں گے۔ ان الفاظ کے ساتھ آپ سب کو بچوں کی دنیا کی پوری ٹیم کی جانب سے یوم آزادی مبارک ہو۔ آپ کا—

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

❑ حیدر بیابانی

ہندوستان والے

ہندوستان والے جنّت نشان والے
البیلی شان والے کیا آن بان والے
ہندوستان والے
جنّت نشان والے

بنگال کے وہ باسی مدراس کے نواسی
کشمیری شان والے پنجابی آن والے
ہندوستان والے
جنّت نشان والے

کعبہ ہے جن کے من میں کاشی ہے تن بدن میں
مرلی کی تان والے مسجد اذان والے
ہندوستان والے
جنّت نشان والے

دھرتی ہری ہے جن کی جھولی بھری ہے جن کی
متوالے محنتوں کے کھیتی کسان والے
ہندوستان والے
جنّت نشان والے

الفت کے بدلے الفت نفرت کے بدلے نفرت
پھولوں کی ڈالیاں بھی تیر و کمان والے
ہندوستان والے
جنّت نشان والے

مٹی سے جن کا رشتہ سپنا بھی ہے فلک کا
دھرتی کے لال بھی ہیں اونچی اُڑان والے
ہندوستان والے
جنّت نشان والے

Hyder Bayabani
Basera,
Achal Purcity 444806 (Maharastra)

خاور نقیب

پھلوں کا مشاعرہ

نیند سے بوجھل آنکھوں میں خواب نے بازو پسارے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مرزا غالبؔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر طرف خاموشی کا راج ہے۔ دالان کے بیچوں بیچ چند افراد باداب بیٹھے ہیں اور چلمنوں کی سرسراہٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین بھی کان لگائے بیٹھی ہیں کہ غالبؔ اب بولیں گے۔ تب بولیں گے۔ آخر کار ایسا ہی ہوا۔ مرزا غالب نے زبان کو جنبش دی۔

غالب: میاں تفتہ! کیا آج چپ رہنے کی قسم کھائی ہے۔ ارے میاں کچھ سناؤ بھی۔ حکم ملتے ہی منشی ہر گوپال تفتہ کے سامنے شمع دان رکھ دیا گیا۔ تفتہؔ اشعار سنانے لگے۔ دالان میں واہ واہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ رفتہ رفتہ محفل پر وہ رنگ چھایا کہ اہلِ محفل کیف و سرور میں ڈوبتے چلے گئے۔ ابھی شمع دان حرکت میں تھی کہ ایک شخص سر پر ٹوکری اٹھائے دالان میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی غالبؔ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ گویا محفل کے رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔

غالب : بھئی! یہ کیا تک ہے، منہ اٹھائے یونہی آدھمکے۔ نہ اجازت طلب کی اور نہ دستک دینے کی زحمت اٹھائی۔ میاں آخر ہو کون؟

نو وارد: حضور! معافی چاہتا ہوں۔ بیگاری نے ہمارے اخلاق کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ورنہ ہم بھی آپ ہی کے جیسے انسان تھے۔

غالب : میاں ہم نے کب کہا کہ تم انسان نہیں ہو۔ خیر! آنے کا مقصد بتاؤ اور تمہارے سر پر یہ بوجھ کیسا ہے؟

نو وارد: حضور! نواب شہاب الدین خاں صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور آپ کے لئے بہ طورِ خاص تحفہ بھیجا ہے، (یہ کہتے ہوئے نو وارد شخص سر سے ٹوکری اتار کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔)

غالب : (سوچتے ہوئے) ارے ہاں! تم شاید نواب ثاقب کے کارندے ہو۔

نو وارد: جی جناب! میں انہی کا ملازم ہوں۔ یہ خاص تحفہ نواب شہاب الدین خاں ثاقب نے ہی بھیجا ہے۔

غالب: تو میاں دیر کس بات کی ہے۔ تحفے کا دیدار بھی کرا دو۔

نو وارد شخص ٹوکری کے اوپر سے گھاس پھوس کی تہہ کو ہٹا دیتا ہے۔ غالب کچھ آگے کو جھک کر دیکھتے ہیں اور ماشاء اللہ کہہ کر اچھل پڑتے ہیں۔

غالب: (نو وارد سے) میاں لنگالیے، نکالیے، کیا خوب تحفہ بھیجا ہے۔ آہاہاہا۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ، ارے میاں، تم پر اور تمہارے نواب صاحب پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں۔ تمہارا بغیر اجازت کے آنا بھی مبارک ہو۔ جاؤ بھئی، میں نے تمہیں اور تمہاری سات پشتوں کو معاف کیا۔ نواب صاحب کو میرا سلام کہنا۔ ان سے کہنا کہ اس تحفے نے ہمارے دل کو باغ باغ کر دیا ہے۔

نو وارد: حضور! ایسا ہی ہوگا۔ اب مجھے رخصتی کی اجازت دیجیے۔

غالب: ارے اتنی جلدی بھی کیا ہے رات یہیں گزار لو۔

نو وارد: حضور! ذرہ نوازی کے لئے ممنون ہوں۔ لیکن نواب صاحب کا حکم ہے کہ تحفے پہنچا کر الٹے پاؤں ہی لوٹ آؤں۔

غالب: (ہاتھ ملتے ہوئے) چلو، یہ بھی ٹھیک ہے۔ جاؤ میاں، تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ نو وارد سلام کر کے چلا جاتا ہے۔

غالب : (ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ارے کیا یونہی بیٹھے رہو گے۔ آؤ انھیں دیکھو اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ۔ یہ ہمارا چہیتا پھل آم ہے۔ آم، آہاہاہا۔

غالب نے ٹوکری سے کئی آم نکالے اور بڑی روانی کے ساتھ ان کی قسمیں، ذائقے اور فائدے گناتے چلے گئے۔ غالب کی زبان آم کے قصیدے پڑھ رہی تھی۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ سید بلگرامی اور دوسرے لوگوں نے بھی آم کی تعریفیں کیں اور جب غالب نے تعریفی اشعار پڑھے تو محفل واہ واہ کی آوازوں سے جاگ اٹھی اور پھر شعر پر شعر سنائے جانے لگے۔ شعر و شاعری کی یہ محفل اتنی دلچسپ تھی کہ اچانک ٹوکری کے آموں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ سبھی ٹوکری سے سر نکال کر محفل کا رنگ دیکھنے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ غالب کی ٹوکری کے اندر کچھ کھسر پسر ہوئی اور لنگڑا آم ٹوکری سے نکل کر دبے قدموں باہر نکل گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے گلی کو عبور کیا اور سڑک پر پہنچتے ہی دوڑ لگادی۔ لنگڑا آم شاید دیوانہ ہوگیا تھا یا اسے اتنی ہی جلدی تھی کہ بس منہ اٹھائے ایک طرف دوڑتا ہی چلا گیا۔ وہ ہانپتا ہوا جب پھلوں کے بادشاہ (یعنی دسہری آم) کے دربار میں پہنچا تو اس کی سانسیں پھول پچک رہی تھیں۔ لیکن اس نے محفل مشاعرہ کا ایسا

نقشہ کھینچا کہ بادشاہ اور سارے درباری مبہوت ہو کر رہ گئے۔ دربار میں کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا۔ کچھ وقفے کے بعد بادشاہ کی گونج دار آواز ابھری۔

بادشاہ: (درباریوں سے مخاطب ہوکر) آپ لوگوں نے سن لیا غالب کی محفل میں ہمارا کیا مقام ہے اور انھوں نے ہماری کیسی قدر کی ہے؟

ایک درباری آم: (ہاتھ باندھ کر) جہاں پناہ! مرزا غالب نے ہمیں جو عزت بخشی ہے وہ ہمارے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔

لنگڑا آم: جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔ عالی جاہ! مری دلی خواہش ہے کہ حضرتِ غالب کی یاد میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے اور اس میں پھل برادری کے بھائی بہنوں کو دعوت دی جائے کہ وہ اپنا کلام پیش کریں۔

بادشاہ: (تخت پر ہاتھ مارتے ہوئے) آفرین، آفرین، واہ میاں لنگڑے۔ تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر۔ صاحبو! جس شاعر کو ہم دل و جاں سے عزیز ہیں اور وہ ہماری قدر بھی کرتا ہے۔ اس کی یاد میں مشاعرہ ضرور ہونا چاہیے۔

پورے دربار میں سبحان اللہ آفرین، آفرین کی صدائیں گونج اٹھتی ہیں۔

بادشاہ: (رعب دار آواز میں) کاتب کو حاضر کیا جائے۔

حکم سنتے ہی ایک درباری آم قلم دوات اور تختی سنبھالے حاضر ہوتا ہے اور فرشی سلام کرکے ایک طرف کھڑا ہوجاتا ہے۔

بادشاہ: پھل برادری کی طرف سے ایک دعوت نامہ تحریر کیا جائے۔ اس میں یہ بات واضح کر دی جائے کہ آئندہ اتوار کو ''آم باغ'' میں پھلوں کا مشاعرہ ہوگا۔ نقارچی کے لیے حکم ہے کہ وہ باغ باغ گھوم کر مشاعرے کا اعلان کردے۔ تخلیہ......

بادشاہ تخت سے اٹھ جاتا ہے۔ درباری آپس میں بات چیت کرتے ہوئے، باہر نکل آتے ہیں۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق کاتب نے دعوت نامے کا مضمون تیار کیا اور اس پر شاہی مہر لگا کر لنگڑے آم کے حوالے کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مشاعرے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ دوسرے روز صبح سویرے نقارے کی آواز گونج اٹھی۔ ڈم ڈم۔ ڈم ڈم۔ نقارے کی آواز سن کر درخت اور جھاڑیوں کی ٹہنیاں زور زور سے ہلنے لگیں اور پھل آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہوگئے۔ انھوں نے دیکھا۔ بگھی پر دو چار آم صافے باندھے، ہاتھوں میں چوب لیے نقارے پر چوٹ لگا رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر دور دور تک پیڑوں پر بھونچال سا آگیا۔ طرح طرح کے پھل پیڑوں سے اتر کر بگھی کے آس پاس جمع ہوگئے۔ ایک آم شاہی فرمان نامہ پڑھ کر سنانے لگا۔ ''سنو، سنو! پھل برادری کے بھائی بہنوں کو بادشاہ سلامت کی طرف سے اطلاع دی

جاتی ہے کہ آئندہ اتوار کو آم باغ میں مرزا غالبؔ کی یاد میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوگا۔ آپ تمام حضرات سے شرکت کی درخواست ہے۔ سنو، سنو! ڈم ڈم۔ ڈماڈم۔

شاہی اعلان سنتے ہی پھلوں کی دنیا میں مشاعرے کی اک لہر سی دوڑ گئی۔

جدھر دیکھئے دو چار پھل قلم کاپیاں سنبھالے گنگنانے میں مصروف ہیں۔ کوئی خیال میں ڈوبا ہوا ٹہل رہا ہے تو کوئی شعر پر شعر کہے جارہا ہے۔ کچھ منچلے پھل پیڑ کے سائے میں جمع ہیں۔

ان میں سے ایک نے رائے پیش کی کہ ہمارے بادشاہ کو یہ کیا سوجھی کہ پوری قوم گنگنانے کے مرض میں مبتلا نظر آتی ہے۔ دوسرے پھل نے کہا، ”میاں قوالی یا کشتی کا مقابلہ ہوتا تو ہم بھی حصہ لیتے۔“ تیسرے نے ہنس کر کہا ”دوستو! مجھے تو لگتا ہے کہ بادشاہ نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ ورنہ آم کو مشاعرے سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ پھلوں کی دنیا میں طرح طرح کی باتیں اور مشاعرے کی خبریں کانوں کان اڑ کر تہلکہ مچا رہی تھیں۔ پھلوں میں جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ اتوار کے منتظر تھے۔ جب مشاعرے کی ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو آم باغ میں ”ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید۔“ جیسا سماں بندھ گیا۔ یوں ہوتے ہواتے اتوار کا سورج طلوع ہوا تو دلوں میں مسرت کے چراغ روشن ہوگئے۔ گویا صبح سویرے عید کا چاند نظر آ گیا ہو۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا شاعر پھلوں کی مشق اور گنگناہٹ میں تیزی آتی گئی۔ زیادہ تر شاعروں کو اپنے کلام سے زیادہ ترنم کی فکر تھی اور سچ پوچھئے تو کلام کو ترنم میں ڈھالنا اس قدر مشکل کام تھا کہ اس کوشش میں کئی شاعر ’نروس بریک ڈاؤن‘ کا شکار ہوگئے۔

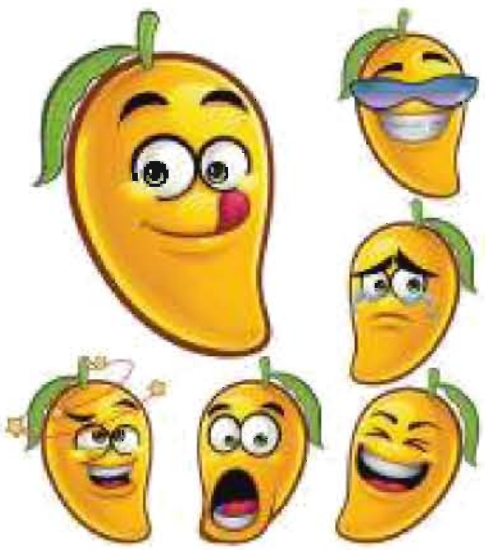

دوپہر ڈھلتے ہی دیکھا گیا کہ مشاعرہ سننے والے گروہ در گروہ آم باغ کی طرف رواں دواں ہیں۔

جب شاعر پھلوں نے دیکھا کہ سامعین کی قطاریں چھوٹ رہی ہیں تو ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ مشاعرہ پڑھنے کی خوشی اور اندر کی گدگداہٹوں نے انھیں بھی اکسایا کہ ”چلئے حضور! آپ بھی سج دھج کر تیار ہوجایے۔ ایسا نہ ہو کہیں تاخیر ہوجائے۔“ دل میں یہ خیال آتے ہیں کسی نے سرمہ دان پر جھپٹا مارا تو کسی نے عطردان کی تلاش شروع کردی۔ کچھ شاعر پھلوں نے تو کنگھی کی لیکن بہتوں نے اپنے بالوں کی بے ترتیبی اور بکھراؤ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی بلکہ یونہی رہنے دیا کہ شاعرانہ حلیے کی کچھ لاج تو رہے۔ ایک نوجوان شاعر نے تو کمال ہی کردیا۔ بناؤ سنگھار کی افتراتفری میں اس قدر باؤلے ہوئے کہ سر میں روغنِ زیتون کی شیشی انڈیل لی اور آنکھوں میں سرمہ کی جگہ غازہ لگالیا۔ جلدی جلدی میں ٹوپی کچھ یوں پہنی کی پھندنا ناک کی دم بن گیا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ ان کو اپنی اس حالت زار کا نہ تو کوئی ہوش تھا اور

نہ کچھ پرواہ تھی۔ انھوں نے بغل میں بیاض دابی اور چلنا شروع کردیا۔

دالان سے گزر کر باہر نکلے تو دیکھا سامنے سے ایک بگھی چلی آرہی ہے۔ بگھی ذرا قریب آئی تو معلوم ہوا یہ چار گھوڑوں والی شاہی بگھی ہے۔ جو بہ طورِ خاص شاعروں کے لیے بھیجی گئی ہے۔ ادھر شاہی بگھی بان نے شاعر پھلوں کے نام لے لے کر سواری کی اطلاع دی۔ پھر کیا تھا دیکھے ہی دیکھتے اتنا رش ہوا کہ بگھی شاعروں کے بوجھ سے چرچرانے لگی اور گھوڑے باچھیں نکال کر ہنہنانے لگے۔ بگھی بان نے جوں ہی لگام ڈھیلی چھوڑی بگھی ایک جھٹکے ساتھ چل پڑی۔ البتہ بھیڑ اتنی تھی کہ سبھوں کو پسینے آنے لگے۔ لیچی خانم کو ڈر تھا کہ کہیں میک اپ نہ بگڑ جائے۔ اس بھیڑ بھاڑ اور دھکا پیل سے تنگ آ کر ایک گول مٹول سے شاعر نے اس زور سے کہنی ماری کہ بگھی بان اچھل کر گھوڑے کی ایال (گردن کے بال) سے جھول گیا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ بے چارا گرنے سے بچ گیا۔ ورنہ گھوڑوں نے اسے روند دیا ہوتا۔ اللہ اللہ کر کے فاصلے طے ہوئے اور سامنے آم باغ کا خوبصورت منظر آیا تو اس کی سجاوٹ پر سب کی آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ بگھی رکتے ہی کئی آم دوڑ آئے اور انھوں نے شاعروں کو مشاعرہ گاہ کے ایک مخصوص مقام پر لا کر بٹھا دیا۔

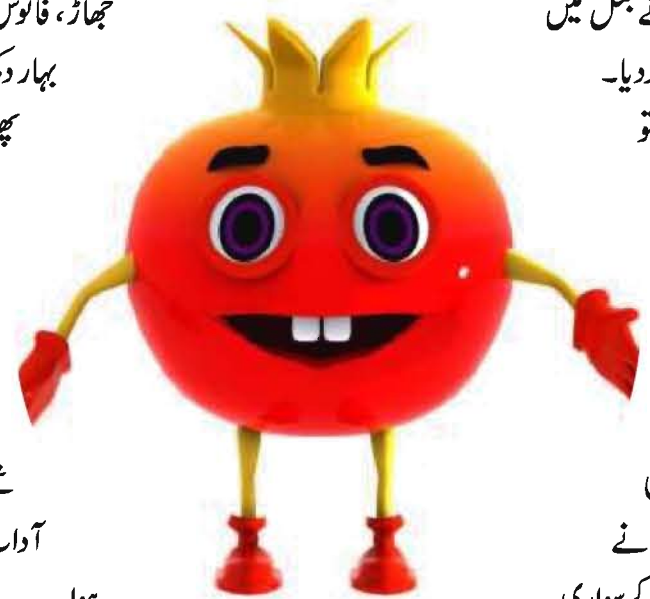

مشاعرہ گاہ کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر طرف جھاڑ، فانوس اور قمقموں کی روشنی عجب بہار دکھا رہی تھی۔ شاہی تخت پر پھلوں کا بادشاہ دسہری آم سر پر تاج رکھے بڑے ہی کرّوفر کے ساتھ براجمان تھا اور سامعین خوبصورت نشستوں پر صف بہ صف بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد لنگڑا آم آداب بجاتا ہوا اسٹیج پر نمودار ہوا۔

لنگڑا آم: بادشاہ سلامت کا اقبال بلند ہو۔ عالی جاہ سے درخواست ہے کہ وہ اجازت مرحمت فرمائیں تو مشاعرے کی کاروائی کا آغاز کیا جائے۔

بادشاہ سر کے اشارے سے اجازت دیتا ہے۔

لنگڑا آم: پھل برادری کے بھائیو اور بہنوں! آموں کے قدرداں شاعر حضرتِ غالب کی یاد میں آج جو مشاعرہ منعقد کیا گیا ہے۔ یہ ہمیشہ یادگار بنا رہے گا۔ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ آج کی اس محفل کو بارونق اور تاریخی بنانے کے لیے ہمارے درمیان بادشاہ سلامت بھی جلوہ افروز ہیں۔ میں اس مشاعرے کی صدارت کے لئے بادشاہ حضور کی رضامندی کا خواستگار ہوں۔

بادشاہ سر ہلا کر اپنی رضامندی کا ظہار کرتا ہے۔ مرحبا، مرحبا، آفرین، آفرین، کی صدائیں بلند ہوتیہیں اور بادشاہ شمع روشن کرتے ہوئے اپنی رعب دار آواز میں غالب کا یہ شعر پڑھتا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کے ہے اندازِ بیاں اور

شعرسن کرسامعین واہ واہ کراٹھتے ہیں۔

لنگڑا آم : حضرات! اب انتظار کی گھڑی ختم ہوئی۔ مشاعرہ اب شروع ہی ہوا چاہتا ہے۔ آج ہمارے درمیان پھلوں کی دنیا کے جانے مانے شعرائے کرام موجود ہیں۔ میں سب سے پہلے انار فانوس کو دعوتِ سخن دیتا ہوں۔ وہ تشریف لائیں اور اپنے شیریں کلام سے اس تاریخ ساز مشاعرے کا آغاز کریں۔

انار فانوس: محترم حضرات! مشاعرہ اردو زبان اور اس کی تہذیب کو بڑھاوا دینے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔لہٰذا ہمیں چاہئے کہ مشاعرے کی شائستہ تہذیب اور اس کے معیار کا ہمیشہ خیال رکھیں۔صدرِ محترم کی اجازت سے پہلے دو شعر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرر ہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں: ارشاد ارشاد کی آواز ابھرتی ہے۔

نام لے کر خدائے برتر کا   بزم کا کررہا ہوں میں آغاز
کاش غالب بھی بزم میں ہوتے   ان سے بڑھ جاتا بزم کا اعجاز

سامعین کا اژدہا واہ واہ کرا ٹھتا ہے۔

انار فانوس : اب نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں: عرض کیا ہے۔

رنگ کتنا دل رہا ہے   رس مرا وجہ شفا ہے
قدرتی خانے ہیں مجھ میں   سیکڑوں دانے ہیں مجھ میں
میری شاخوں میں لچک ہے   پھول میں بھی کچھ مہک ہے
بلبل آجاتی ہے اکثر   گویا عاشق ہیں وہ مجھ پر
آپ سے مانوس ہوں میں   جھاڑ کا فانوس ہوں میں

واہ واہ کی زوردار صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ انار آداب بجاتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔

لنگڑا آم: محترم حضرات! میں کیا اور میری حیثیت کیا۔ جو کچھ بھی بن سکا ہے۔ وہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرر ہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:(ارشاد ارشاد کی آواز ابھرتی ہے)

کس قدر میٹھا ہوں بھائی   واقعی اچھا ہوں بھائی
مجھ کو بندر سے ہے وحشت   بلبلوں سے ہے محبت
پیڑ میرا سائباں ہے   سر بہ سر راحت رساں ہے
ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوں   سبز فطرت کی دعا ہوں
سبز ہے میری جوانی   پر عجب ہے یہ کہانی
اب تو بوڑھا ہوگیا ہوں   یعنی پیلا ہوگیا ہوں

مشاعرہ گاہ سے واہ واہ کی آوازیں ابھریں اور مشاعرے کا ایک سماں سا بندھ گیا۔

لنگڑا آم : اب آپ کے سامنے ایسی شاعرہ کو پیش کرنے جارہا ہوں جس کی سریلی آواز آپ کے کانوں میں رس

گھول دے گی۔ مری مراد محترمہ لیچی خانم سے ہے۔ وہ تشریف لائیں اور اپنی آواز کا جادو جگائیں۔

لیچی خانم : حضرات! نظم لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ نظم پڑھ کر بھی مشاعرہ لوٹا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

(ارشاد ارشاد کی تکرار ابھرتی ہے۔)

حسن اور رنگت میں لاثانی ہوں میں   پھل کا راجا آم ہے، رانی ہوں میں

سننے والے پھڑک اٹھتے ہیں۔ داد و تحسین کی آواز سے امرائی گونج اٹھتی ہے۔

پیڑ پر گچھوں کی صورت جھومتی   اپنے پتوں کو مسلسل چومتی
من چلے چڑیوں کے بازو کھولتی   ان کی چونچوں میں مسرت گھولتی
پھیلتی ہے باغ میں خوشبو مری   گرمیوں میں دھوم ہے ہر سو میری
میرے شربت کا مزا کچھ اور ہے   اس میں پنہاں فائدہ کچھ اور ہے
خاص کر بچوں کو للچاتی ہوں میں   ہاں جی ہاں، لیچی ہی کہلاتی ہوں میں

لیچی خانم کے ہر شعر پر سامعین نے خوب داد دی۔

لنگڑا آم : محترمہ لیچی خانم نے مشاعرے میں جو روح پھونکی ہے۔ اس میں رنگ بھرنے کے لیے میں سیب کشمیری کو دعوتِ سخن دیتا ہوں۔ وہ تشریف لائیں۔

سب کشمیری: میں انتہائی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی۔ چند اشعار حاضر کرر ہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

(ارشاد ارشاد کی آواز ابھرتی ہے۔)

بڑوں اور چھوٹوں کو بھاتا ہوں میں   مریضوں کے دل کو لبھاتا ہوں میں
مری شکل و صورت ہے کیا ہی حسیں   زمانے میں مجھ سا کوئی پھل نہیں
جہاں بھر کی شہرت ہے حاصل مجھے   وقار اور عزت ہے حاصل مجھے
ہے ڈل جھیل کا حسن مجھ میں بھرا   مرے رس میں کشمیر کی ہے ادا
اگر دام سستا ہے بکتا ہوں خوب   دکانوں میں، ٹھیلوں پہ سجتا ہوں خوب
مجھے طشتری پر سجاتے ہیں لوگ   بڑے ہی سلیقے سے کھاتے ہیں لوگ
مرا رنگ دل کش ہے عالی جناب   مرے ذائقے کا نہیں ہے جواب
میں جنت کے پیڑوں کی توقیر ہوں   مجھے ناز ہے، سیبِ کشمیر ہوں

سیب کشمیری کو داد تو خوب ملی۔ لیکن ایک گوشے سے خربوزے نے ہانک لگائی ”واہ بھئی واہ۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کیا خوب مثال پیش کی ہے۔“ یہ جملہ سنتے ہی سیب سٹ پٹاتا ہوا مائیک سے ہٹ گیا۔

لنگڑا آم :اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مشاعرہ بہت دلچسپ ہوتا جارہا ہے۔ اب میں کٹھل نوک دار سے درخواست کرتا ہوں۔ وہ تشریف لائیں اور اپنی نظم سے سامعین کو محظوظ کریں۔

کٹھل نوک دار: (صدر مشاعرہ سے اجازت طلب کرتے ہوئے) حضرات! یہ اردو زبان کی شیرینی اور اس کی لطافت کا فیض ہے کہ یہاں اس کے چاہنے والوں کی اک بڑی تعداد جمع ہوگئی ہے اور اس محفل کے اہتمام کا

سہرا بادشاہ سلامت اور ان کے درباریوں کے سر جاتا ہے۔شعر حاضر کررہا ہوں۔ملاحظہ فرمائیں:

میں سراپا جل ہوں لوگو	اک بڑا سا پھل ہوں لوگو
پیڑ سے گرتا ہوں اکثر	گر کے پھٹ جاتا ہوں اکثر
میں ہوں قدرت کا عجوبہ	کس قدر میٹھا رسیلا
منہ میں اک لذت جگادے	میرا سالن بھی مزا دے
باغ میں کثرت تھی میری	دل میں بھی چاہت تھی میری
پیڑ میرے کٹ رہے ہیں	ابر سر سے چھٹ رہے ہیں
اب تجارت کا ہوں ساماں	چند ساعت کا ہوں مہماں
روح گھائل، جسم زخمی	دل ہے رنج وغم سے چھلنی
میرے پیڑوں کو بچاؤ	ان پرندوں کو بلاؤ
جو مسلسل چہچہائیں	ٹہنیوں کو گدگدائیں
گھونسلے اپنے بنائیں	بے گھری کو بھول جائیں
اے پرندو، لوٹ آؤ	مجھ کو کٹنے سے بچاؤ

اس نظم کو سامعین نے خوب سراہا اور بادشاہ نے بھی اپنی پسند کا اظہار کیا۔

لنگڑا آم :اب میں چاہتا ہوں کہ ایک ایسے شاعر کو پیش کیا جائے جو محفل کو اور بھی شیریں بنادے۔اب آپ کے روبرو جناب انگور فرحت آبادی اپنا کلام لے کر حاضر ہورہے ہیں۔

انگور فرحت آبادی: حضرات! مجھ سے پہلے کتنے ہی پروانے آئے اور شمع اردو پر اپنی جان فدا کر کے امر ہو گئے۔میں بھی ایک چھوٹی سی نظم لے کر حاضر ہوں، عرض کیا ہے:

(ارشاد ارشاد کی آواز بلند ہوتی ہے)

زرد مائل سبز ہوں اور جامنی	کیا بھلی ہے میری صورت موہنی
شکل وصورت میں وہ آب وتاب ہے	کانچ کی گولی میں گویا آب ہے
صبح دم کنجوس بن جاتا ہوں میں	دوپہر کو جوس بن جاتا ہوں میں
جگ میں اردو کی طرح مشہور ہوں	خوبصورت خوشۂ انگور ہوں

اس شعر پر مکرر مکرر کی صدائیں بلند ہوئیں۔اب مشاعرہ اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ہر طرف آواز ہی آواز تھی۔

لنگڑا آم :شکریہ حضرات! یہ مشاعرہ جو کامیابی کی بلندی پر پہنچ چکا ہے اس کو مزید اونچائی پر لے جانے والے شاعر جناب سنترہ گول مٹول سے التماس ہے کہ وہ مائک پر تشریف لائیں۔

سنترہ گول مٹول: بڑے اچھے موقع پر حاضر ہوا ہوں۔امید ہے کہ میرے اشعار بھی پسند کیے جائیں گے۔جیسے حاضر کررہا ہوں۔

دل نشیں ہے نام میرا	ذکر، صبح و شام میرا
شکل وصورت دل ربا ہے	ذائقہ بھی کیا بھلا ہے
شاہ کے دربار میں ہوں	ہاٹ اور بازار میں ہوں
اک جہاں میرا فدائی	میں ہوں شربت کی صراحی
گلوب جیسا دل نشیں ہوں	میں بھی گویا اک ''زمیں'' ہوں
دل کو للچاتا ہوں سب کے	رال ٹپکا تا ہوں سب کے

آخری شعر پر چٹخارے لینے کی آواز ابھری اور لیچی خانم کی تو رال ہی ٹپک پڑی۔

لنگڑا آم: جناب سنترہ کی اس کھٹی میٹھی نظم کے بعد بندہ اپنا کلام پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔(صدر مشاعرہ سر ہلا کر اجازت دیتے ہیں۔)

عرض کیا ہے:

پھل کی دنیا کا ہوں راجا	سب کی نظروں کا ہوں تارا
رنگ میں عالی نسب ہوں	ذائقے میں بھی عجب ہوں
آج امرائی سجی ہے	شاعری اٹھلا رہی ہے
پھول، پتے جھومتے ہیں	شعر کے لب چومتے ہیں
شاعری حاوی ہے سب پر	اک جنوں طاری ہے سب پر
پر مرا دل رو رہا ہے	چین اپنا کھو رہا ہے
جنسِ طالب تھا کبھی میں	جانِ غالب تھا کبھی میں

نظم کی روانی ہی ایسی تھی کہ سامعین جھوم جھوم اٹھے۔دیر تک داد وتحسین کا شور بلند ہوتا رہا۔

لنگڑا آم: میں اس عزت افزائی کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ اب رات آخری زینے پر کھڑی الوداع کہہ رہی ہے۔ میں جناب تربوز دل شاد کو دعوتِ سخن دیتا ہوں، وہ تشریف لائیں۔

عین اسی وقت بھائی اخروٹ اور شہتوت ریشم پوری ہانپتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ آئے۔ جب بادشاہ کی ان پر نظر پڑی تو انھوں نے ایک رقعہ لکھ کر ناظم مشاعرہ (یعنی لنگڑا آم) کو دے دیا۔

لنگڑا آم: حضرات! کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے قبیلے کے دو ''شاعر'' جو ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ان کے لیے بادشاہ سلامت کا حکم ہے کہ وہ مشاعرے میں حصہ نہیں لے سکتے۔ یہ اعلان سنتے ہی اخروٹ جھٹ سے کھڑا ہوگیا۔

بھائی اخروٹ: جہاں پناہ! یہ سراسر ظلم ہے۔قسم لے لیجیے، ہم دونوں بہت دور سے آئے ہیں۔ رات گئے سواری بھی نہیں ملی۔لہٰذا ہم کو پیدل ہی آنا پڑا۔لیکن تاخیر کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے ہزار کوششیں کیں غزل تو دور ایک مصرع بھی نہیں ہوسکا۔ لہٰذا ہم نے پڑوس کے ایک ’’استاد شاعر‘‘ میاں آلو بخارے سے التجا کی کہ وہ ہمارے لئے غزلیں لکھ دیں۔ انھوں نے ڈھائی اشرفیوں کے عوض کلام دینے کا وعدہ تو کیا لیکن دینے میں بڑی دیر کردی (غالباً! انھیں بھی حالٹ، قبض درپیش تھی)

جہاں پناہ! اب آپ ہی فیصلہ کیجیے۔

بھائی اخروٹ کی باتوں پر وہ زوردار قہقہہ پڑا کہ خدا کی پناہ۔ پوری محفل لوٹ پوٹ ہوگئی۔ ہر طرف سے ان پر پھبتیاں کسی جانے لگیں۔کسی نے کہا ’’میاں! خیریت چاہتے ہو تو اسٹیج سے اتر جاؤ۔ کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہو۔‘‘ کٹھل نوک دار تو پھٹ ہی پڑے۔کہنے ’’میاں اخروٹ! تم اور تمہارے دوست کے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ دوسرے سے غزل لکھوا کر مشاعرہ پڑھنے آئے ہو؟ اس سے تو بہتر تھا کہ ڈھائی اشرفیوں کے عوض دماغ کی کوئی دوا خرید لیتے اور گھر بیٹھے عقل کے گھوڑے دوڑاتے۔‘‘

اس طرح ان دونوں کی بڑی درگت ہوئی۔ جہاں پناہ بھی غصے میں تھے انہوں نے دونوں کو خوب پھٹکارا اور حکم دیا کہ استاد آلو بخارے کو قید کر کے ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔اصل مجرم تو وہی ہے۔لوگوں کی افراتفری اور ان کے تیوروں کو دیکھ کر اخروٹ اور شہتوت کھسکتے ہوئے اسٹیج سے اتر آئے اور باغ کے پچھواڑے غائب ہوگئے۔

لنگڑا آم: افسوس! صد افسوس! ادب کی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی ذلیل حرکتوں سے ہماری ادبی تاریخ داغ دار ہوتی ہے۔شاعری کوئی کھیل تماشا تو ہے نہیں۔ یہ نعمت تو کسی کسی کو ملتی ہے۔ بہرحال میں اس حادثے کے لئے معذرت خواہ ہوں اور اک بار پھر تربوز دل شاد سے میری التماس ہے کہ وہ اپنا کلام پیش کریں۔

تربوز دل شاد: بغیر کسی تمہید کے شعر حاضر کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(ارشاد ارشاد کی آواز آتی ہے)

لو کی شدت سے بیر رکھتا ہوں   سرد گودوں میں خیر رکھتا ہوں
ظاہرا! سبز، سرخ ہوں اندر   کاٹئے اور کھائیے جم کر
سرخ قتلوں سے رس ٹپکتا ہے   اور کھانے کو دل لپکتا ہے
گرمیوں میں سکون دیتا ہوں   دل سبھوں کے میں جیت لیتا ہوں
گھونٹ بھر بھر کے پیجیے شربت   آئے مہماں تو دیجئے شربت
ڈھیر ساری خاصیت مجھ میں   دی ہے قدرت نے عافیت مجھ میں

کیا خوب کہا ہے، واہ جناب واہ کی زوردار آواز ابھرتی ہے۔تربوز آداب کرتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔

لنگڑا آم: محترم سامعین کرام! آج کا مشاعرہ ہر اعتبار سے کامیاب رہا ہے۔اس محفل میں غالب تو نہیں ہیں لیکن ہمارے دلوں میں ان کی محبت اور قدر و منزلت کے چراغ روشن ہیں۔ اب میں انتہائی ادب واحترام کے ساتھ صدرِ محترم سے التماس کرتا ہوں کہ وہ اپنے صدارتی کلام سے ہم سبھوں کو شادکام کریں۔

صدرِ مشاعرہ تخت سے اٹھ کر مائک پر آتے ہیں۔خوش آمدید، مرحبا، مرحبا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

صدرِ مشاعرہ: میرے عزیز بھائیو اور بہنو! یہ آپ حضرات کی ادب نوازی کا کھلا ثبوت ہے کہ آج کا مشاعرہ حد درجہ کامیاب وکامران رہا۔ میں تو شعر وعر کہتا نہیں۔لیکن آموں کے شیدائی حضرتِ غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار چند شعروں میں کیا ہے۔ وہ آپ حضرات کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ملاحظہ فرمائیں:

(ارشاد ارشاد کا شور ابھرتا ہے)

فکر کی دنیا کے وہ سلطان تھے   آم پر سو جان سے قربان تھے
پھینک کر مے سے چھلکتے جام کو   قدر کی نظروں سے دیکھا آم کو
آپ نے آموں کو بخشا اک وقار   ہم ادب میں ہوگئے بااعتبار
اے مرے مرزا، مرے نوشہ لقب   آپ کی آموں سے تھی الفت عجب
ہند میں ہیں آپ ہی شاہِ سخن   آپ کا دم بھرتی ہیں گنگ و جمن
اے ہمارے قدرداں لیجیے سلام   غالب معجز بیاں لیجیے سلام

سامعین کی داد و تحسین اور نعروں سے پورا باغ جھوم اٹھا۔پھلوں نے اپنے بادشاہ کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کیں اور انھیں خوب سراہا۔

لنگڑا آم: میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ جیسے باذوق حضرات نے مشاعرے میں شرکت کی اور اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔بہت بہت شکریہ! خدا حافظ!

اسی وقت شٹر کھلنے کی گڑگڑاہٹ نے ٹوکری کے سارے آموں کو نیند سے بیدار کر دیا۔انھوں نے حیرت بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔مگر وہاں نہ غالب کی محفل تھی اور نہ مشاعرہ گاہ کا کوئی نام ونشان تھا۔اس پر ستم یہ کہ اچانک دکان دار نے ٹوکری اٹھائی اور ’’آم لے لو، آم لے لو‘‘ کی ہانک لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔پھر کیا تھا کئی گاہک لپکتے ہوئے آئے اور آموں پر ٹوٹ پڑے۔

Khawar Naqeeb
"Tarweej"
P.O. Kood, Sungra
Dist, Cuttack (Odisha)-754221

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان

سنہری فیصلہ

جوتوں کے لئے بھی کوئی لڑتا ہے؟ خلیفہ نے یہ دیکھا تو وہ شرمسار ہوگئے۔ کیا اسی دن کے لیے انھوں نے اپنے بیٹوں کی بہترین پرورش کی تھی۔ انھوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اپنے دور کے نامی گرامی استاد پڑھانے کے لیے مقرر کیے تھے۔ گھوڑسواری سکھانے کے لیے بھی ماہر گھوڑسواروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ یعنی لڑائی کے گر سکھانے والے بھی دربار عالی میں تھے۔ غرض یہ کہ خلیفہ وقت نے اپنے دونوں شہزادوں کی تعلیم وتربیت میں کوئی کمی نہ آنے دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس لیے وہ ان پر بے پناہ دولت بھی خرچ کرتا اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ بچوں کے استادوں کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ کی جاتی۔ خلیفہ اپنے ذاتی خرچ میں سے اساتذہ کو ہر ماہ معقول تنخواہ دیتا، اکثر وبیشتر ان کو اعلیٰ اور قیمتی تحفوں سے نوازتا۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ یہی نہیں وہ اپنے بچوں کے لیے دعائیں بھی کرتا کیونکہ خدا کے یہاں اولاد کے حق میں، ماں باپ کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

خلیفہ خود بھی اپنے وقت کا درویش تھا۔ اسکے یہاں بزرگوں، عالموں، ولیوں، فقیروں اور ضرورت مندوں کا تانتا بندھا رہتا۔ وہ سب کی حاجتوں کو پورا کرتا۔ بزرگوں سے نصیحت کرنے کو کہتا۔ ان پر عمل کرتا اور ان کی خدمت کرتا۔ آو بھگت میں کوئی کمی نہ آنے دیتا۔ وہ اگرچہ شہرت یافتہ خلیفہ تھا لیکن اس کے باوجود اس کا دربار بادشاہوں اور شہنشاہوں کا دربار نہیں تھا۔ یہ ایسا دربار نہ تھا جہاں ناچ گانے ہوتے ہوں۔ جہاں محفل موسیقی سجتی ہو۔ وہ دربار تو اللہ والوں کا دربار تھا۔ جب کسی ملک کے بادشاہ یا خلیفہ کا یہ رنگ ہو تو ظاہر ہے اس ملک کی رعایا بھی نیک سیرت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے مالک کو بوجھ نہیں سمجھتی بلکہ اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہے۔ یہ خلیفہ بھی ایسا ہی ہر دل عزیز اور سب کا چہیتا تھا۔ لوگ اسے دل وجان سے چاہتے تھے۔ اسے پلکوں پر بٹھاتے تھے، اس کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ اس کا دور اسلامی تاریخ کا بہترین دور تھا۔

خلیفہ نے دیکھا کہ ان کے شہزادے، جوتوں کے لیے لڑ رہے ہیں اور ان کے استاد محترم پاس ہی کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر خلیفہ کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ یہ کیسے استاد ہیں؟ بجائے بچوں کو ڈانٹنے کے خاموشی سے کھڑے ہوئے ہیں۔ خلیفہ کو نہ اپنی آنکھوں پر یقین آیا اور نہ اپنے کانوں پر۔ اس نے تو اپنے وقت کے سب سے اچھے اور مشہور ومعروف استاد سمجھ کر ان کو بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مقرر کیا تھا۔ خود مولوی صاحب نے بھی کبھی خلیفہ کو شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے پوری طرح آزاد تھے۔ ان پر کسی طرح کی کوئی روک ٹوک نہیں لگائی گئی تھی۔ وہ جتنی دیر چاہے بچوں کو پڑھاتے، جیسی چاہے نصیحت کرتے، ان کو پوری اجازت تھی کہ وہ بچوں یعنی شہزادوں کو مار بھی سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ انھوں نے بچوں کو مارا ہو۔ اور مارتے بھی کیوں؟ بچوں نے بھی تو تعلیم حاصل کرنے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ مگر آج یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

خلیفہ وقت حیرت میں تھا، شہزادے جوتوں کے لیے لڑ رہے تھے، اور مولوی صاحب شوخی سے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

آخر خلیفہ سے رہا نہ گیا، اب تک تو وہ ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑے، خفیہ طریقے سے شہزادوں کو آپس میں ایک دوسرے سے ضد کرتے دیکھ اور سن رہے تھے لیکن اب انھوں نے سوچا کہ سامنے آکر حقیقت جاننا چاہیے۔

خلیفہ کے سامنے آتے ہی دونوں شہزادے سہم گئے اور ان کے استاد بھی پریشان ہوگئے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کہ دنیا کے اس جلیل القدر اور عالی مرتبت خلیفہ کو اس وقت کیا جواب دیں۔

خلیفہ نے سامنے آتے ہی زور دار آواز کے ساتھ شہزادوں سے پوچھا ''یہ کیا معاملہ ہے؟ تم دونوں آپس میں کیوں بحث کر رہے ہو؟'' خلیفہ نے ناراض ہوتے ہوئے یہ بھی کہا ''تم دونوں استاد کا ادب واحترام بھی بھول گئے ہو۔''

بچے گھبرا گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور

ندامت سے اپنے سر جھکا لیے۔ ٹھیک ہے وہ ان کے شفیق اور مہربان باپ تھے لیکن آخر وہ ایک عظیم الشان خلیفہ بھی تو تھے اس لیے اچانک ان کا خاموش ہوجانا ایک فطری بات تھی لیکن بچوں کی خاموشی دیکھ کر ان کے استاد نے ہی خلیفہ سے یہ کہتے ہوئے بات کی پہل کی کہ یہ بچے اس بات کی بحث کر رہے ہیں کہ استاد کے جوتے کون اٹھائے گا؟ حالانکہ استاد کو بھی اس بات کا خدشہ تھا کہ استاد کے جوتے اٹھانے کی بات سن کر شاید خلیفہ کچھ ناراض ہوں۔

لیکن واقعہ کی پوری نوعیت سمجھ کر خوشی کے مارے خلیفہ کی آنکھیں چھلک آئیں۔ شروع میں تو وہ ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں میرے بچوں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔ اب بچوں کی ایسی اعلیٰ تربیت دیکھ کر اور ان کے کردار کی ایسی شاندار مثال پا کر اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بچوں کی تربیت میں اس کی کوششیں بیکار نہیں گئی ہیں۔

اتنے میں خیالوں میں ڈوبے خلیفہ سے استاد محترم نے عرض کیا کہ آپ ایک عادل اور انصاف پسند خلیفہ ہیں۔ اس لیے اب آپ ہی یہ فیصلہ کریں کہ اپنے استاد کے جوتے کون سا شہزادہ اٹھائے گا۔ چھوٹا یا بڑا۔ لیکن خلیفہ کے لیے دونوں شہزادے برابر تھے۔ بہت پیارے اور دل وجان سے زیادہ عزیز! وہ جانتا تھا کہ خدمت سے ہی عزت حاصل ہوتی ہے اور خاص کر وہ لوگ جو اپنے بزرگوں، استادوں اور والدین کا ادب واحترام کرتے ہیں، ان کو تو دنیا جہان میں ضرور عزت وشہرت اور ناموری ملتی ہے۔

بہر حال اس نے فیصلہ دیا اور فیصلہ بھی وہ جو بہترین اور غیر معمولی تھا اور صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ میرا ایک بیٹا استاد کا ایک جوتا اٹھائے اور میرا دوسرا بیٹا استاد کا دوسرا جوتا اٹھائے گا۔

فیصلہ سن کر جوش مسرت سے استاد کی آنکھیں بھر آئیں۔

انھوں نے خلیفہ کے دونوں شہزادوں کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

یہ خلیفہ ہارون رشید تھے جو اپنی رعایا پروری اور نیک نفسی کے لیے مسلمانوں میں آج بھی عقیدت واحترام سے یاد کیے جاتے ہیں اور یہ دونوں شہزادے مامون اور امین تھے جن کے اندر خلیفہ ہارون رشید جیسے باپ کی خوبیاں تھیں تو زبیدہ جیسی نیک سیرت، سخی اور عبادت گزار ماں کی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ جس نے کثیر رقم خرچ کر کے طائف سے مکہ تک، غریب عوام کے لیے ایک نہر کھدوائی تھی۔ نہر زبیدہ۔

Dr. Mohd. Athar Masood Khan
Ghous Manzil, Talab Mulla Irum
Rampur-244901 (UP)

عابد علی خاں

نیک شرارت

شام ہوتے ہی محلے کے سبھی بچے اکٹھے ہو کر کھیل کود میں لگ جاتے۔ انہیں اچھلنا، کودنا، ناچنا گانا اور خوب شور مچانا بہت پسند تھا۔ اکثر کھیل کی شروعات بھاگ دوڑ اور چھپا چھپی سے شروع ہوتی۔ جیسے جیسے کھیل آگے بڑھنے لگتا بچے ٹولیوں میں بٹ کر چور، سپاہی یا پھر ایسا کوئی کھیل کھیلتے جس میں مار پیٹ اور لڑائی کی جائے۔

کوئی بچہ چور بنتا، کوئی سپاہی تو کوئی ڈاکو یا حولدار۔ اس طرح کے کھیل کھیلتے ہوئے انہیں خوب مزا آتا۔ محلے کے کئی بزرگوں نے سمجھایا کہ ایسے کھیل کھیلنا ٹھیک نہیں ہوتا کسی کے چوٹ بھی لگ سکتی ہے مگر کسی بچے نے ان باتوں کی پرواہ نہ کی۔ انہیں لگتا تھا ایسی نصیحت دینا تو بڑوں کی عادت ہے۔ وہ ایک کان سے سنتے دوسرے کان سے نکال دیتے۔

انہیں تو کھیل ہی اسی طرح کے پسند تھے جن میں خوب مار پیٹ کا موقع ملے یا پھر کسی انسان یا جانور کو کوئی دکھ پہنچے۔ کبھی کسی چڑیا کا گھونسلا توڑ دیا۔ کبھی چیونٹیوں کو بلاوجہ مار ڈالا اور

کبھی کسی کتے کو اینٹ مار کر اسے اپاہج بنا دیا۔ ایسی حرکتیں کر کے انہیں خوب مزا آتا تھا۔

جب کبھی ان کا دل کسی کھیل میں نہیں لگتا تو ان کا ایک پیارا شغل تھا محلے کے ایک بوڑھے آدمی شرفو کو ستانا۔ شرفو ایک غریب آدمی تھا۔ محلے میں اس کا پرانا سا گھر تھا جس میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ بے چارہ بیمار رہتا تھا اس لیے کوئی کام بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر سے مانگ کر اپنا گزر کرتا تھا۔

جیسے ہی وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اپنے گھر سے باہر نکلتا محلے کے سبھی بچے پیچھے سے اس کے کپڑے کھینچنے لگتے۔ کوئی سر پر تھپڑ مار کر بھاگ جاتا، کوئی اس کا نام لے کر فقرے کستا۔ وہ شریر لڑکوں کی ان حرکتوں سے پریشان ہو کر گالیاں دیتا، برا بھلا کہتا اور بد دعائیں دیتا۔

کئی بار محلے کے کسی بزرگ کا دھیان جاتا تو بچوں کو خوب ڈانٹتے اور سمجھاتے کہ اس طرح کسی کو ستانا ٹھیک نہیں مگر بچوں کو تو ایسا کر کے خوب مزا آتا تھا کچھ بچے رات کے وقت شرفو کے گھر کوڑا کرکٹ اور پتھر پھینک کر خوب خوش ہوتے۔ کئی بار بچوں کی ایسی حرکتوں سے شرفو کے سر میں بھی چوٹ لگی۔

اس نے پریشان ہو کر بچوں کے والدین سے شکایت کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ اب بچے اسے اور بھی پریشان کرنے لگے تھے۔ ایک دن انہوں نے شرفو کے بہت سے برتن توڑ ڈالے، اس کے دروازے پر طرح طرح کے پوسٹر چپکا دیے، جیسے ہی اس نے گھر سے باہر نکلنے کی کوشش کی بچوں نے اس کے گھر پر پتھر پھینکے۔

شرفو بے چارہ بھوکا پیاسا گھر میں بیٹھا چیخ چیخ کر بد دعائیں اور گالیاں دیتا رہا۔ مگر بچوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

آخر رات ہونے تک سبھی بچے شرفو کو جی بھر کر پریشان کرنے کے بعد جب تھک گئے تو انہیں بھوک لگنے لگی۔ سبھی کا خیال تھا کہ اب گھر چل کر کھانا کھایا جائے۔

جیسے ہی بچے اپنے اپنے گھروں کی طرف چلنے لگے تو ایک بچے نے کہا:

''یار..... میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا ہے.....''

''وہ کیا.....؟؟'' سبھی بچوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہ ہم لوگ اپنے گھروں سے اچھا اچھا کھانا لا کر شرفو کے گھر رکھ دیں وہ صبح سے بھوکا ہے..... کہیں بھوک سے

مر گیا تو پھر ہم کسے ستایا کریں گے..... دیکھنا کیسے کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔''

''نہیں یار وہ ہمارے ہاتھ سے کوئی چیز لے کر نہیں کھائے گا وہ سوچے گا اس میں بھی ہماری کوئی چال ہے۔'' ایک بچے نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

تبھی دوسرا لڑکا بولا ''یار ہم اسے کھانا دینے کیوں جائیں گے بلکہ اس کے گھر کی پچھلی دیوار جو ٹوٹ رہی ہے وہیں سے چپکے چپکے جا کر اس کے گھر میں کھانا رکھ کر آجائیں گے۔''

سبھی بچوں کو یہ آئیڈیا پسند آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے اپنے گھروں میں کھانا کھانے چلے گئے۔

آدھے گھنٹے بعد سبھی بچے اپنے اپنے گھروں سے تھوڑا تھوڑا کھانا لے کر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے سارا کھانا ایک ٹرے میں لگایا اور اپنے پلان کے مطابق شرفو کے گھر کی طرف چل دیے۔

ایک لڑکے نے پیچھے کی دیوار سے شرفو کے گھر میں قدم رکھا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ شرفو اپنی پلنگ پر سو رہا تھا۔ لڑکے نے خاموشی سے کھانے کی ٹرے شرفو کے پلنگ کے پاس ایک پرانی سی میز پر رکھ دی اور آہستہ سے گھر سے باہر نکل آیا۔

سبھی بچے ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے چھپ گئے۔ انہوں نے شرفو کو جگانے کے لیے گھر میں ایک لکڑی کا ٹکڑا پھینکا۔ لکڑی کا ٹکڑا گرنے سے شرفو کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔

وہ منہ میں بڑبڑاتے ہوئے محلے کے بچوں کو گالیاں دینے لگا:

''کمبخت کہیں کے ضرور یہ محلے کے حرام خور بچے ہیں۔ سبھی میری طرح بیمار ہو کر تڑپ تڑپ کر مریں گے۔ جاہل، بدتمیز کہیں کے.....''

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کی نگاہ اپنے پلنگ کے پاس میز پر رکھے کھانے پر پڑی۔ شرفو نے اٹھ کر چراغ جلایا اور بڑے غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھانے کو دیکھنے لگا۔

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مزے دار اور گرما گرم کھانا اس کی آنکھوں کے سامنے کیسے اور کہاں سے آ گیا۔ جب اُسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ سچ مچ اس کے سامنے کھانا رکھا ہے فوراً ہی شرفو نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا:

''یا میرے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے مجھ بھوکے، غریب اور بیمار کو غیب سے کھانا دیا ہے۔ ورنہ اس محلے میں تو سبھی نامراد لوگ رہتے ہیں۔ یا خدا تو نے یہ کھانا جس انسان کے ذریعہ مجھ تک پہنچایا ہے تو اسے آباد رکھ اور اس محلے کے بچوں کی کبھی کوئی دعا قبول نہ کر جو مجھے ہمیشہ پریشان کرتے ہیں۔''

شرفو جلدی جلدی کھانا کھائے جا رہا تھا اور خدا کا شکر کرتے ہوئے آنسو بہا رہا تھا۔

دیوار کے پیچھے کھڑے سبھی بچوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ انہیں احساس ہو چکا تھا کہ شرفو کو پریشان کر کے وہ کبھی خدا کو خوش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ شرفو اور ایسے کسی بھی محتاج کو کبھی پریشان نہیں کریں گے۔

Abid Ali Khan
Pandian
Malerkotla - 148023 (Punjab)

محمد فروغ جعفری

لالچ بری بلا

بی چیونٹی بڑی خوش تھی کہ اس نے بڑی محنت سے بڑی جدوجہد سے وہ شکر کا دانہ اپنے بل میں پہونچا ہی دیا جو حجم میں وزن میں ان کے اپنے حجم اور وزن سے کافی بڑا تھا، اور جس نے بی چیونٹی کے بل میں پہونچنے کے لیے بی چیونٹی کو کافی پریشان کیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ بی چیونٹی کو کہیں سے شکر کا دانہ مل گیا۔ جسے پا کر بی چیونٹی کافی خوش تھی کہ اس شکر کے دانے کے ملنے کے بعد فی الحال ان کو لگی بھوک اور آئندہ بھی کئی ماہ تک کا کھانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ یعنی کئی ماہ کا راشن انہوں نے ایک ہی وقت میں جمع کر لیا تھا۔ شکر کے دانے کو اپنی بل تک پہونچانے میں انہیں جو تکلیف ہوئی اس کا اندازہ صرف انہیں تھا۔ اول تو بھوکی دوسرے جا بل تک پہونچنے میں شکر کے دانے نے ان کو بہت ستایا۔ دو تین بار راستے میں ہی ان کی پکڑ سے گر گیا۔ پھر سے بی چیونٹی نے اپنے حوصلوں کو یکجا کر کے آخر اسے اپنے بل تک پہونچا کر ہی دم لیا۔

بل میں ایک طرف ترتیب سے اس شکر کے دانے کو بی چیونٹی نے رکھ دیا۔ ذرا دم لیا تھا کہ پھر خیال آیا کہ اگر ایک دو اور شکر کے دانے مل جائیں تو سال بھر راشن سے بے فکر ہو جائیں۔ یہاں وہاں کھانے کی تلاش سے فرصت مل جائے گی۔ بی چیونٹی کے اس خیال نے ہی ان کو بے انتہا خوش کر دیا۔ مگر بی چیونٹی نے ابھی ابھی ایک فتح حاصل کی تھی اس فتح کی خوشی اور نئے خیال نے ان کے قدم پھر سے شکر کے دانے کی تلاش میں اٹھا دیے۔

بہت تلاش کے بعد جہاں شکر کا پہلا دانہ ملا تھا اس کمرے کے بازو والے کمرے میں بی چیونٹی کو اس سے بڑا شکر کا دانہ مل گیا جو یقیناً حجم اور وزن میں پہلے دانے سے زیادہ بڑا تھا۔ بی چیونٹی نے اس شکر کے دانے کو بھی اپنے بل تک پہونچانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو بی چیونٹی نے شکر کے دانے پر قبضہ کیا، پھر ہمت جُٹا کر اسے آہستہ آہستہ دھکہ دینے لگی۔

آخر بڑی جدوجہد کے بعد بی چیونٹی نے شکر کے دانے کو اپنی بل کی دیوار تک لے آئی۔ وہاں پہونچنے تک بی چیونٹی پسینہ پسینہ ہو گئی، مگر سال بھر کی محنت سے چھٹکارہ ملنے کے لالچ میں بی چیونٹی لمحہ بھر دم لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد بی چیونٹی پھر اس شکر کے دانے کو اوپر لے جانے کی تگ و دو میں لگ گئی۔

بی چیونٹی یہ سوچ رہی تھی کہ یہ لمحہ بھر کی تکلیف ہے اور جس طرح انہوں نے اس سے قبل شکر کے دانے کو اپنی بل تک پہونچایا تھا اسی طرح وہ اس شکر کے دانے کو بھی اپنے بل تک پہونچا لے گی۔ مگر اس بار شکر کا دانہ کافی بڑا تھا۔ کم از کم ان کے حجم اور وزن سے تو زیادہ ہی۔ مگر بی چیونٹی تھی کہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ پھر سے کوشش کی تو کچھ دور دیوار پر اوپر کی سمت پہونچ بھی گئیں۔ مگر پھر لمحہ بھر بعد وہ شکر کا دانہ ان سے چھوٹ گیا پھر دوسری، تیسری آخر ساتویں مرتبہ جب وہ تھک کر چور چور ہونے کے باوجود اپنی ضد پر اڑی رہی تو شکر کا دانہ اس بار دیوار سے اپنے ساتھ اسے بھی لے گرا۔ نیچے وہ اس شکر کے دانے کے نیچے اتنی بُری طرح دبی کے چی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

کچھ دور سے گذرتی چیونٹیوں نے جب بی چیونٹی کا یہ حال دیکھا تو ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں۔ بڑی مشکل سے جب سب نے مل کر محنت سے دھکہ لگایا تو بی چیونٹی کی جان اس شکر کے دانے سے آزاد ہوئی۔ آزاد ہونے کے بعد بی چیونٹی نے بڑی خوشی کے ساتھ اپنے لالچ سے توبہ کی۔

محمد فروغ جعفری

دیر نہ ہو جائے

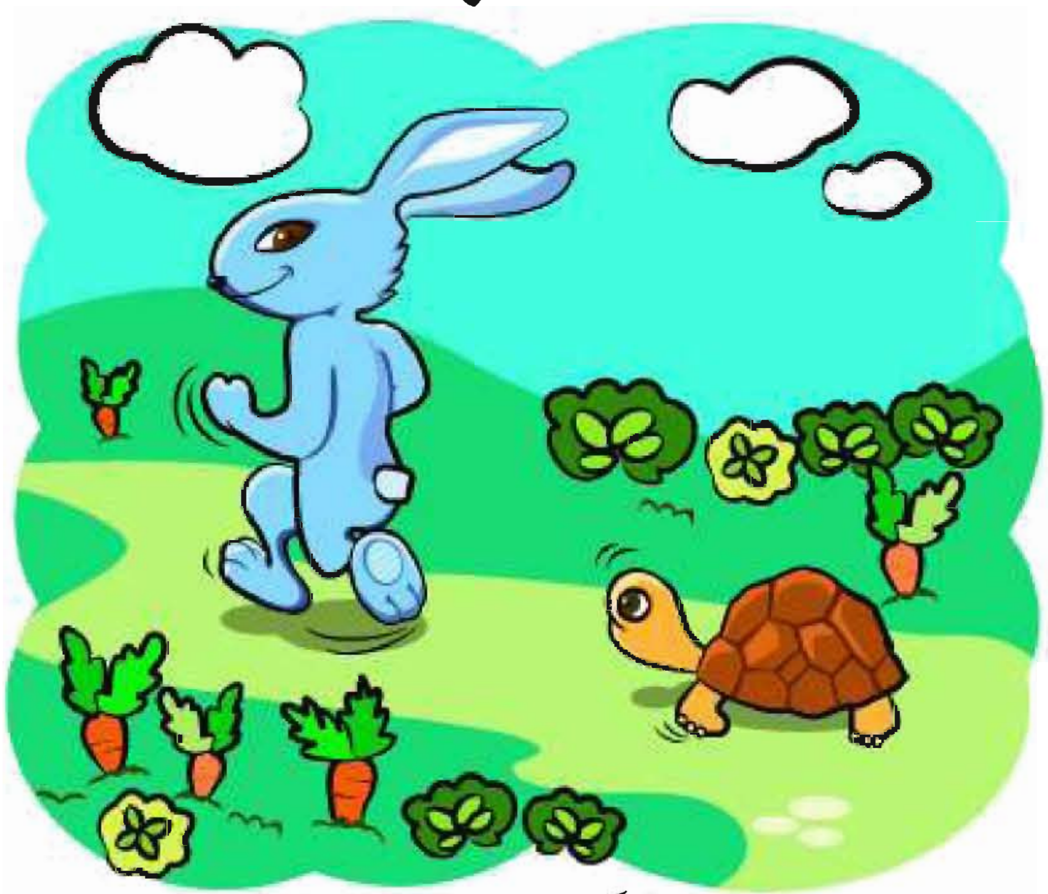

اپنے قریبی چند دوستوں اور ان کے بزرگوں سے کچھوے کو اپنے دادا کی کہانی سننے کو ملی تھیں وہ کہانی، اس مشہور ریس کی تھی جو اس کے دادا کچھوے نے خرگوش کو ہرا کر فتح حاصل کی تھی اور ایک زمانے تک زمانہ ان کی فتح کی مثال دیتا رہا۔ اس جیت کا خمار کئی صدیوں تک کچھوے کے خاندان کے سر پر سوار ہوا، ادھر ہارے ہوئے خرگوش کے خاندان کو بھی اتنے برسوں تک سماج میں بے عزتی برداشت کرنی پڑی۔

آخر دنیا گول ہے پھر سے ویسے ہی حالات ویسی ہی مجبوری، ویسی ہی ضرورت، پھر سے سماج میں جنم لینے لگی کہ جس کے بعد آخر ایک دن خرگوش اور کچھوے میں پھر سے دوڑ کے مقابلے کا فیصلہ کیا گیا۔ خاندان خرگوش اپنی صدیوں پرانی بے عزتی کا بدلہ اس دوڑ کے مقابلے کو جیت کر پھر سے اپنی وہی پرانی عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ادھر کچھوا ایسا بے فکر تھا جیسے اس کے لیے دوڑ کا مقابلہ جیتنا

اپنے سخت خول سے کچھ دیر کے لیے اپنی گردن نکالنے جیسا ہے جسے بچے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں تالیاں بجاتے ہیں اور مداری لوگوں سے پیسے وصول کرتا ہے۔ ابھی تک اس کے بزرگوں کی اس کے پردادا کی فتح کا خمار اس کے ذہن پر سوار تھا اس لیے اس نے دوڑ کے لیے محنت، ریہرسل کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

دوڑ، کے دن گاؤں میں بہت چہل پہل تھی کیونکہ برسوں بعد تاریخ اپنے آپ کو دہرانے جا رہی تھی۔ خرگوش کسی بھی چمک دمک سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ذہن کو کسی بھی دوسری سوچ میں نہ الجھاتے ہوئے بڑی تیزی سے دوڑ کے میدان پہونچا۔ اس کے رشتے دار شرمندگی سے ہی سہی، مگر اپنے خرگوش کا حوصلہ بڑھانے میدان پر موجود تھے۔ ادھر کچھوے کے رشتے دار کچھوے کو عمدہ کپڑے پہنا کر اور ایک بگی میں شہزادوں، راجہ مہاراجہ کی طرح بٹھا کر، ڈھول تاشے بجاتے ہوئے میدان لے کر پہونچے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں کچھوا اپنی بگی سے اترا۔ تالیوں کے شور سے کچھوے کے ذہن میں غرور حد درجہ تک پہونچ گیا۔ وہ سینہ کو تان کر بڑی اکڑ سے ٹریک پر پہونچا۔

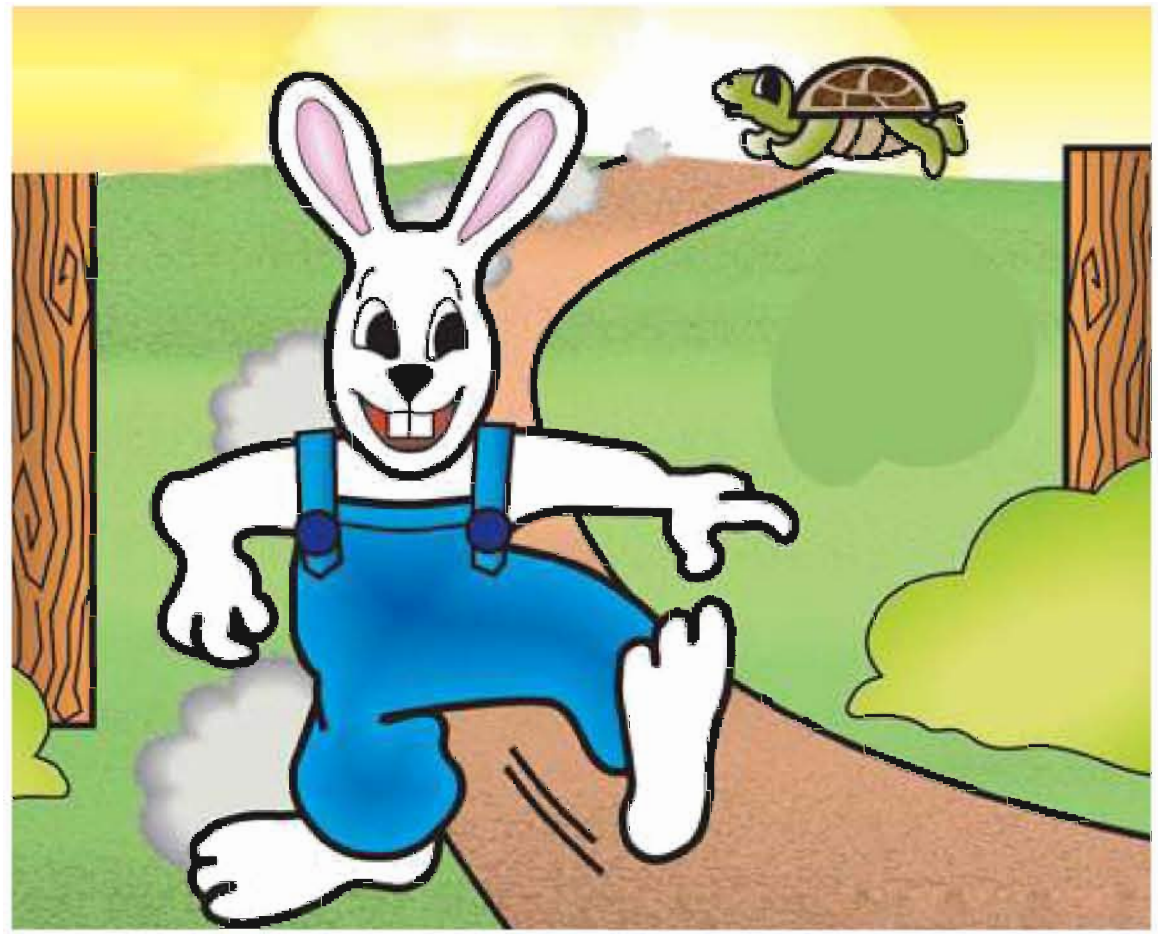

ریفری نے دونوں کو تیار ہونے کا اشارہ کیا۔ خرگوش نے فوراً گردن سے اشارہ کیا۔ کچھوا تو تالیاں بجاتے تماشائیوں کے شور میں ہی محو تھا۔ آخر ریفری نے 'سگنل گن' چلا دی۔ جسے سن کر خرگوش بڑی تیزی سے بھاگا۔ کچھوے کا ذہن جب کنٹری پر گیا تو وہ بھی جلدی سے اپنی سوچ کے مطابق دوڑنے لگا۔ مگر غرور کی وجہ سے اس کے پیر جیسے ہزاروں من وزنی ہو گئے تھے۔ ادھر خرگوش اتنی جلدی فتح حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اپنے پردادا کی غلطی کو نہ دہرانے کے لیے وہ کہیں نہیں رکا اور کس ٹریک پر دوڑ رہا تھا یہی بھول گیا۔

ادھر کچھوا تیزی سے لو چل رہا تھا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ جیت تو اسی کے لیے ہے۔ اس لیے کچھ آہستہ ہوا۔ فخریہ چلنے پر چال کچھ دھیمی ہو ہی جاتی ہے۔ اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ باپ دادا کی طرح جیت اسے ہی ملے گی۔ ادھر خرگوش جب Finish لائن کے قریب پہونچا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا کہ جوش میں وہ اپنا ٹریک ہی بھول گیا ہے۔ وہ پھر سے واپس ریفری کے پاس پہونچا اس سے ٹریک پوچھا اور دوبارہ اپنی دوڑ شروع کی۔ اس بار اسے تھکن کا احساس ہوا تو اس نے اپنی رفتار کچھ آہستہ کی۔ مگر وہ رک کر آرام کرنے کی اپنے بزرگوں کی نقل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے رفتار کم کر کے اپنے ہی ٹریک ہر دوڑتے ہوئے وہ دوسری مرتبہ کچھوے کو پیچھے کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

ادھر کچھوا اپنے ہی غرور اپنے بزرگوں کے کارناموں کو اپنا کارنامہ سمجھ کر بڑی آرام سے ٹریک پر بھاگتا رہا۔ خرگوش نے Finishing line عبور کر کے اپنی فتح کا راؤنڈ پورا کر لیا تھا۔ خرگوش کی فتح سے شائقین میں خاموشی چھا گئی۔ خاندان خرگوش، کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ آخر زمانے بعد انہیں پھر سے خوشی نصیب ہوئی تھی۔ خرگوش کی فتح کے بعد شائقین دھیرے دھیرے میدان سے چلے گئے جن میں کچھوے کے رشتے دار بھی تھے۔

ادھر کچھوا اپنے ہی زعم میں چلتا رہا، بلکہ اس بار تو وہ اپنے پردادا کی رفتار سے بھی آہستہ چل رہا تھا۔ آخر شام ہوگئی تو اس کے ایک دوست نے اسے جا کر بتایا کہ دوڑ کا مقابلہ ختم ہو چکا ہے۔ سب گھر چلے گئے۔ تم اس بار ہار گئے۔ چلو گھر۔ کچھوا یہ سن کر حیران پریشان ہو گیا۔ اپنی ہار کا اسے یقین نہ ہوا۔ مگر جب اس نے آنکھیں کھول کر نظر دوڑائی تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ تمام لوگ جا چکے تھے جو صبح دوڑ سے پہلے اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔ راجہ مہاراجہ، شہزادوں کی طرح اس کا استقبال کر رہے تھے۔ کچھوے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اپنے دوست کے ساتھ اپنے گھر کے پچھلے دروازے کی طرف شرمسار رواں تھا۔

Md Farogh Jaffery
67, Hood Colony, Malegaon.

بابو آر کے

''گھنٹی...... بجے نہ بجے''

پچھلے دنوں سے بلی خالہ کو اپنی آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگا تھا۔ اس لیے چوہوں کے شکار میں پریشانی ہو رہی تھی۔ بھوک کے مارے خالہ کے پیٹ میں چوہے دوڑتے، لیکن ہفتہ ہفتہ بھر وہ ایک بھی چوہا نہ کھا پاتی۔ خالی پیٹ میں اس کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھتیں اور بلی خالہ منہ کھولے لمبی لمبی جمائیاں لیتے ہوئے گھر کے ایک کونے میں پڑتی رہتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ بلی خالہ کمزور ہونے لگی۔ اس حالت پر اکثر چوہے اس کا مذاق اڑانے لگے تھے۔ کبھی کوئی چوہا اس پہ کود پڑتا، تو کوئی دبے پاؤں اس کی دم کھینچ کر نکل بھاگتا۔ کوئی شرارتی چوہا تو اس کے نازک نازک پتلے پتلے کان بھی کاٹنے لگتا۔ چوہوں کی ان تمام حرکتوں پر بے چاری بلی خالہ غصہ میں لال پیلی ہو کر رہ جاتی اور غرّاتے ہوئے ہوا میں یونہی ادھر ادھر پنجے مارتی۔

گھر میں دوسرے چوہوں کے ساتھ ہی ایک رامو نامی چوہا بھی رہا کرتا تھا۔ یہ وہی رامو چوہا تھا جس کے دادا شامو چوہے کو گھر کے تمام چوہوں نے برادری سے باہر نکال دیا تھا۔ طے ہوا تھا کہ جب بلی خالہ شکار کرنے آئے تو اس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی بجنے لگے اور پھر سب چوہے گھنٹی کی آواز سن کر جان بچانے کے لیے بھاگ جائیں۔ بلی خالہ کے گلے میں کون گھنٹی باندھے۔ یہ طے کرنے کے لیے سب چوہوں کے ناموں کی پرچیاں ڈالی گئیں۔ پھر ان میں سے ایک پرچی اٹھائی گئی۔ اتفاق سے یہ

پرچی رامو چوہے کے دادا کے نام کی نکل آئی۔ اب تمام چوہوں نے اسے بلی خالہ کے گلے میں گھنٹی باندھنے کو کہا۔ اپنی جان کے خوف سے اس نے گھنٹی باندھنے سے انکار کیا۔ اس وقت رامو چوہے کے دادا شامو چوہے سے تمام چوہے ناراض ہو گئے اس طرح انھوں نے اسے اپنی چوہا برادری سے نکال کر

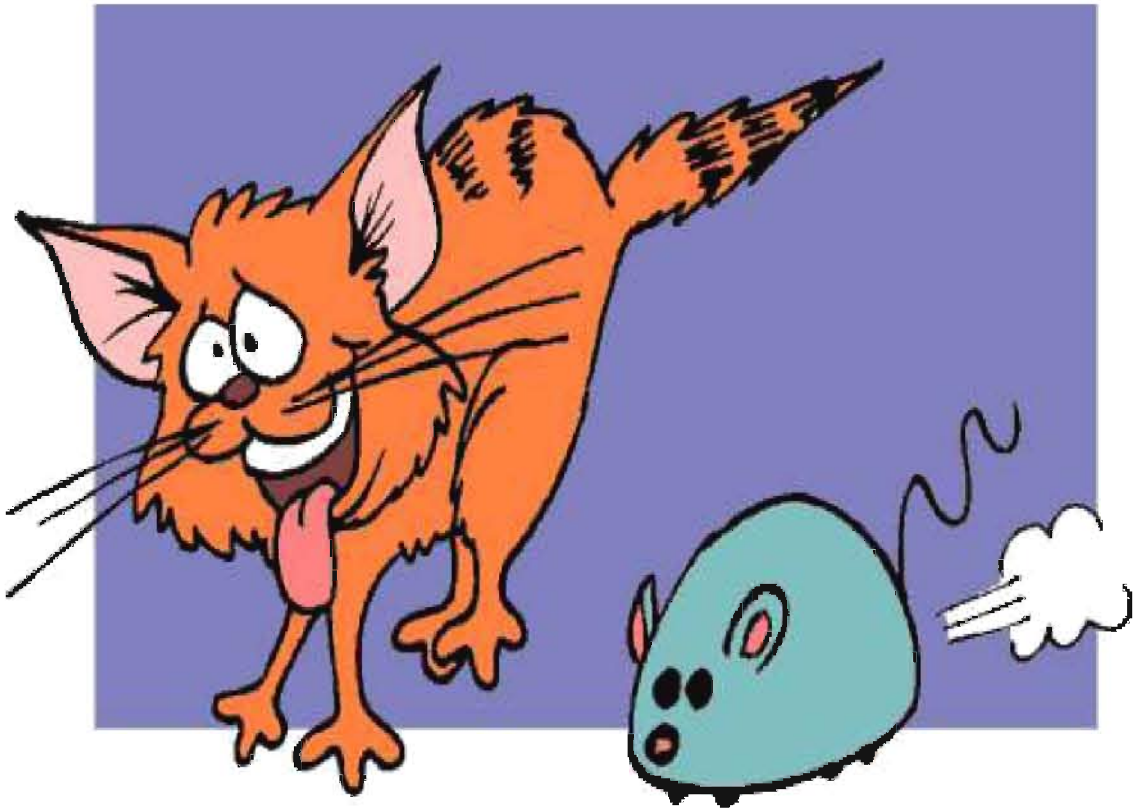

ذات باہر کر دیا تھا۔ رامو چوہا...... بہت دنوں سے اپنے دادا کی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ ایک دن وہ بلی خالہ کے ایک دم پاس تو نہیں گیا لیکن ذرا نزدیک ضرور گیا۔ سلام کرنے کے بعد ہمدردی کے لہجہ میں کلام کرتے ہوئے بولا......''بلی خالہ! میرا نام رامو ہے، میں شامو چوہے کا پوتا ہوں۔'' ''اچھا اچھا...... تو تو شامو چوہے کا پوتا ہے۔ ارے تیرا دادا تو بڑا نیک چوہا تھا۔'' اور بلی خالہ دعائیں دینے لگی۔ خدا تیرے دادا کو کروٹ کروٹ جنت دے اور جنت میں کھانے کے لیے خوب سارا غلہ دے اور کترنے کاٹنے کے لیے کپڑوں کے نئے نئے تھان بھی دے۔ ارے اس بے چارے نے تو میرے گلے میں گھنٹی باندھنے سے انکار کیا تھا۔ ورنہ سب چوہوں نے تو میرا دانہ پانی ہی بند کر دیا تھا۔ اس وقت میری روزی روٹی کا وہی تو سہارا بنا تھا۔ وہ بے چارہ اپنی ذات برادری سے باہر ہو گیا لیکن میرے گلے میں گھنٹی نہیں باندھی۔ بلی خالہ کی یہ تمام باتیں سن کر رامو چوہے نے ادھر ادھر دیکھا اور سرگوشی میں بولا ''بلی خالہ میں نے اپنے دادا کی بے عزتی کا بدلہ لینے کی قسم کھائی ہے۔ میں سب چوہوں کو مزہ

چکھا کر ہی رہوں گا۔'' بلی خالہ نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''وہ کیسے بیٹا؟'' وہ بولا پرانے زمانے میں چوہوں نے تمہارے گلے میں گھنٹی باندھنے کا پروگرام بنایا تھا کہ نہیں؟'' بلی خالہ بولیں ''بالکل صحیح ہے۔ بنایا تھا۔'' رامو چوہے نے جوش میں کہا'' اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب میں سارے چوہوں کے گلوں میں گھنٹیاں باندھوں گا۔'' رامو چوہا ترس کھاتے ہوئے بولا ''تمہیں آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہے نا۔ اس لیے گھنٹی بجتے ہی تم سمجھ جانا کہ کوئی چوہا آیا ہے اور گھنٹی کی آواز پہ جھپٹ پڑنا اور شکار کرکے چوہوں کو کھاتی جانا۔'' یہ سن کر بلی خالہ خوشی سے پھولی نہ سمائی اس نے رامو چوہے کو ایک منہ لاکھ دعائیں دیں۔ ''جگ جگ جیو بیٹا، پھولو پھلو، بلیوں کے عذاب سے بچو، خوب غلہ کھاؤ خوب کپڑے کترو، پلیگ کے جرائم سے بچو......'' اتنی دعائیں دینے کے بعد وہ بولیں ''دیکھ بیٹا جس دن تو سب چوہوں کے گلوں میں گھنٹیاں باندھ دے گا اس دن میرے پاس آنا میں تجھے بہت بڑا انعام دوں گی۔'' انعام کا نام سن کر رامو چوہا خوشی خوشی بلی خالہ کے پاس سے لوٹا اور سیدھا چوہوں کے پاس گیا اور بولا'' میرے بھائیو! یہ تو آپ سب کو معلوم ہی ہے کہ بلی خالہ سے میرے کتنے اچھے تعلقات ہیں۔'' سب چوہوں نے گردن ہلادی۔ رامو چوہا بولا'' میں ابھی ابھی ان ہی کے پاس سے آرہا ہوں۔ میں نے بلی خالہ کو ان کے اور اپنے دادا کے تعلقات کا واسطہ دے کر درخواست کی ہے کہ وہ اس گھر میں میرے ساتھ رہنے والے چوہوں کو نہ کھایا کریں۔ میری اس درخواست پر بلی خالہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ آج سے وہ صرف پڑوسیوں کے گھروں میں رہنے والے چوہوں کو ہی کھائیں گی اس گھر میں رہنے والے چوہوں کو ہاتھ نہ لگائیں گی۔'' یہ سن کر تمام چوہوں نے تعجب سے پوچھا ''بلی خالہ کو بہت کم دکھائی دیتا ہے دوسرے سارے چوہے ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر بھلا وہ ہمیں اور پڑوس کے چوہوں کو پہچانیں گی کیسے؟'' رامو چوہا بولا'' یہ بھی تم نے اچھی کہی، پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد رامو چوہا بولا'' اچھا ایسا کرتے ہیں اس گھر میں رہنے والے ہم سب چوہے اپنے اپنے گلے میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھتے ہیں جس سے ہوگا یہ کہ بلی

خالہ گھنٹی کی آواز سے پہچان لیں گی کہ یہ چوہا اپنے گھر کا ہے اور بغیر گھنٹی والا چوہا پڑوس کا ہے۔ اس طرح بلی خالہ پڑوس کے چوہوں کو کھائیں گی اور ہماری جانیں بچ جائیں گی۔'' رامو چوہے کی ترکیب سن کر سب چوہوں نے اس کی عقل کی داد دی اور شاباشی بھی دی۔ اس طرح رامو چوہے نے اپنے تمام ساتھی چوہوں کے گلوں میں ننھی منی گھنٹیاں باندھ دیں۔ گھنٹیاں باندھنے کے بعد وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اب مزہ آئے گا اب میرے دادا کی بے عزتی کا بدلہ میں سارے چوہوں سے لوں گا۔ وہ مسکرانے لگا۔ اپنے گلوں میں گھنٹیاں باندھنے کے بعد تمام چوہے آزادی کے ساتھ گھر میں پھرے گے اور پھر...... بلی خالہ انہیں آسانی سے ہضم کرتی جائیں گیں۔ یہی سب باتیں سوچتے ہوئے رامو خوشی خوشی بلی خالہ کے پاس گیا اور بولا'' بلی خالہ، بلی خالہ میں نے سب چوہوں کے گلے میں گھنٹیاں باندھ دیں ہیں۔ اب تم آسانی سے بے فکر ہوکر چوہوں کو کھاتی جانا۔ جب سو چوہے کھا چکو، تو مجھے دعائیں دیتی ہوئی حج کو چلی جانا۔ یہ سن کر بلی خالہ ایک دم خوش ہوگئی۔ بولی'' بیٹا! تو نے میرا اتنا بڑا کام کردیا ہے اس کے بدلے میں کیا تو اپنا انعام نہیں لے گا؟'' رامو بولا'' میں اپنا انعام لینے ہی تو تمہارے پاس آیا ہوں خالہ۔ یہ سنتے ہی بلی خالہ گھر کے ایک کونے میں گئی اور دیوار کی طرف منہ کرکے زمین کریدنے لگیں۔ رامو چوہا خوشی خوشی انعام کے لالچ میں بلی خالہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد بلی خالہ فوراً پلٹی اور غرا کر رامو چوہے کو اپنے پنجے میں دبوچ لیا اور بولی'' ارے بیٹا رامو! بعد کا کیا بھروسہ ہے رے گھنٹی بجے نہ بجے، اس لئے ابھی ہاتھ آئے موقع سے کیوں نہ فائدہ اٹھالوں۔ اور گھنٹی بجنے تک کیوں نہ تیرا ناشتہ کرلوں۔'' یہ کہتے ہوئے بلی خالہ نے رامو کو کچ کرکے اپنے دانتوں میں دبوچ لیا اور اسے چٹ کرگئی۔

اس طرح خالہ بلی نے موقع سے فائدہ اٹھالیا اور اپنے بھائیوں کو دھوکا دینے اور برادری سے بغاوت کرنے کے جرم میں رامو چوہے کو موت کا انعام دے دیا۔

Babu R. K
Qasid Pura, Achalpur city
Dist Amravati 444806 (Maharashtra)

مبین احمد انصاری

پڑھنے والی ٹیچر

خالد میاں ایک موٹر گیرج میں کام کرتے تھے۔ان کے دو بچے تھے۔ بڑی بچی کا نام صوفیہ تھا جو میونسپل اُردو اسکول کی چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ بڑی ذہین بچی تھی۔ چھوٹی بیٹی رابعہ تھی جو اسی اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔مگر صوفیہ کی طرح ذہین نہ تھی۔

رابعہ کی کلاس کے بہت سے بچے ٹیوشن جایا کرتے تھے۔ ان بچوں کو دیکھ کر رابعہ نے اپنی امی سے ٹیوشن جانے کی خواہش ظاہر کی۔اس کی امی نے سمجھایا کہ تم صوفیہ کے پاس پڑھو۔ رابعہ کہنے لگی۔ میں تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹیوشن جاؤں گی۔

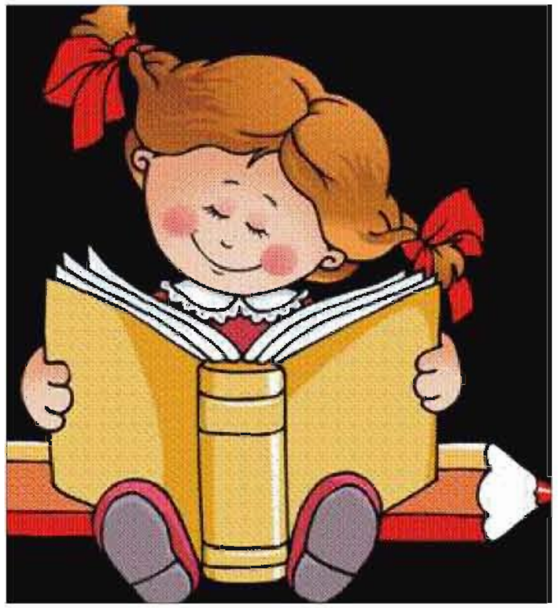

امی نے اسے صوفیہ کے پاس ٹیوشن پڑھنے کے فائدے بتائے مگر رابعہ نہ مانی۔اس کی ضد کو دیکھتے ہوئے امی نے اسے ٹیوشن کی اجازت دے دی۔

رات میں جب خالد میاں گھر آئے تو انہیں ٹیوشن کی بات بتائی تو خالد میاں کہنے لگے۔اتنی مہنگائی روم کا کرایہ، دوا علاج اور دیگر اخراجات الگ۔اب اوپر سے ٹیوشن کا خرچ۔ ابّو کی باتیں سن کر رابعہ رونے لگی۔خالد میاں اس کو روتا ہوا نہ دیکھ سکے۔انہوں نے بھی ٹیوشن کی اجازت دے دی۔رابعہ کو بہت خوشی ہوئی دوسرے دن سے وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹیوشن جانے لگی۔

بڑھتے ہوئے اخراجات اور مہنگائی کی وجہ سے خالد میاں نے اُوور ٹائم کام کرنا شروع کر دیا۔جس کی وجہ سے وہ رات میں دیر سے گھر آتے تھے۔ چند دنوں میں ہی صوفیہ نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ اس کے ابّو اب رات میں دیر سے آتے ہیں اور بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔صوفیہ نے رابعہ کو بھی یہ بات بتائی۔رابعہ نے بھی اس بات پر توجہ دی تو اسے بات سمجھ میں آ گئی۔صوفیہ کہنے لگی تم ٹیوشن چھوڑ دو۔ میں پڑھائی میں ٹیوشن سے زیادہ تمہاری مدد کروں گی۔مہینہ مکمل ہونے کے بعد رابعہ نے ٹیوشن جانا بند کر دیا۔روزانہ شام میں دونوں بہنیں پڑھائی کے لیے گیلری میں بیٹھنے لگیں۔

صوفیہ رابعہ کو بالکل ٹیچر کی طرح سمجھاتی، پڑھاتی سوالات کرتی اس کی غلطیوں کی اصلاح کرتی اور حوصلہ افزائی بھی کرتی۔رابعہ کو اپنی بہن کے پاس پڑھنے میں ٹیوشن سے زیادہ لطف آ رہا تھا تو ادھر صوفیہ بھی اپنی چھوٹی بہن کو پڑھا کر خوش تھی۔ساتھ ہی وہ اپنی پڑھائی بھی کرتی۔

ان کے والدین نے جب بچوں کو اس طرح پڑھائی کرتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ایک دن جب دونوں بہنیں پڑھائی کر رہی تھیں تو امّی نے خالد میاں سے کہا۔ دیکھیے تو سہی۔ اپنی صوفیہ بالکل ایک ٹیچر کی طرح رابعہ کو پڑھاتی ہے۔خالد میاں کہنے لگے ۔واقعی صوفیہ اس کو پڑھانے میں بہت محنت کرتی ہے۔ شاید اتنی محنت ٹیوشن ٹیچر بھی نہ کرتے ہوں۔دونوں بہنوں کی محبت اور لگن کو دیکھ کر پڑوس کی چند عورتیں صوفیہ سے کہنے لگیں کہ ہمارے چھوٹے بچوں کو بھی ٹیوشن پڑھا دیا کرو۔ جو بھی فیس ہوگی ہم دیں گے۔ یہ سن کر صوفیہ نے کہا۔ آنٹی میں کوئی ٹیچر تو نہیں ہوں کہ اتنے بچوں کو ٹیوشن پڑھا سکوں۔لیکن پڑوسی اصرار کرتے رہے۔تب صوفیہ نے کہا کہ میری امی سے بات کریں۔ جب انہوں نے اس کی امی سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ کہنے لگیں صوفیہ تو ابھی خود پڑھ رہی ہے۔وہ کیسے دوسرے بچوں کو پڑھائے گی؟

’’مگر وہ تو رابعہ کو بہت اچھے طریقے سے پڑھاتی ہے۔‘‘

ایک پڑوسن نے کہا

''رابعہ کو پڑھانا اس کی مجبوری ہے ورنہ خود اس کی عمر ابھی کھیلنے کودنے کی ، ہے: مگر کیا کریں۔'' اتنا کہہ کر صوفیہ کی امی خاموش ہوگئیں۔

''ہمارے بچے چھوٹی کلاسوں میں ہیں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔'' دوسری پڑوسن کہنے لگی۔ ''ٹھیک ہے میں اس کے ابّو سے مشورہ کر کے کل جواب دوں گی۔'' اس کی امی نے ان کو ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ مگر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ خالد میاں رات میں گھر لوٹے تو بیگم کو خوش وخرم دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ بہت خوش نظر آ رہی ہو۔''

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔''

''ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ کیا بات ہے'' خالد میاں نے کہا

''پڑوسن کی عورتیں اپنے بچوں کو صوفیہ کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجنا چاہتی ہیں۔''

''کیا؟'' خالد میاں کو یقین نہیں آیا۔

''جی ہاں''۔ ''میں مذاق نہیں کر رہی ہوں میں نے انہیں جواب کے لیے کل بلایا ہے اب آپ ہی بتائیے کیا کرنا چاہیے۔''

''بھئی میں کیا بتاؤں؟ جو کرنا ہے صوفیہ کو کرنا ہے وہ تیار ہو۔ اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔''

''کیا بیٹا! تم کیا کہتی ہو؟'' خالد میاں نے خاموش بیٹھی ہوئی اپنی لاڈلی بیٹی سے پوچھا۔

صوفیہ کہنے لگی۔ ''ابو میں تیار ہوں۔''

صفیہ نے سوچا ٹیوشن فیس کے ذریعے اپنے ماں باپ کی کچھ مدد کر سکے گی۔

''ابو! میں بھی باجی کے ساتھ بچوں کو پڑھاؤں گی۔'' بطلہ نے جھٹ سے کہا۔

''ہاں! ٹھیک ہے تم ٹیوشن میں مانیٹر کے فرائض انجام دینا'' امی نے اسے تسلی دی۔

پڑوسی دوسرے دن اپنے بچوں کو لے کر آ گئیں اور صوفیہ جس کی عمر ابھی خود ٹیوشن پڑھنے کی تھی۔ ٹیوشن پڑھانے لگی صوفیہ عام بچوں پر خوب محنت کرتی۔ جس کی وجہ سے اس کے ٹیوشن میں بچوں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ مزید بچوں کی گنجائش نہ ہی۔ صوفیہ صبح میں طالب علم تھی تو شام میں ٹیوشن ٹیچر۔ اس کے ٹیوشن لینے سے گھر میں پہلے جیسی تنگی نہ رہی اور خالد میاں نے اُوور ٹائم کام کرنا چھوڑ دیا۔ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے بچوں کو دینے لگے۔

ایک دن صوفیہ اپنی امی سے کہنے لگی۔ امی میں دعا کیا کرتی تھی کہ میں ٹیچر بنوں لگتا ہے میری دعا قبول ہو گئی اور میں بھی سے ٹیچر بن گئی۔

Mobin Ahmad Ansari
1392, Gulshan Aisha Daal wala
Chowk, Momin purah
Malegaon 423203 (Nasik)

نصرت جہاں

نئی روشنی

پیارے بچو! یہ دو بہنوں کی کہانی ہے۔ جو اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں غازی پور میں رہتی تھیں ایک بہن کا نام عرشیہ اور دوسری کا ماہی تھا دونوں ہی بہت سمجھ دار اور ذہین تھیں لیکن عرشیہ اپنی ذہانت کا استعمال پڑھائی میں نہ کر کے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت برباد کرتی تھیں ماہی سارا دن پڑھائی میں مصروف رہتی دل لگا کر محنت کرتی اور کامیابی حاصل کرتی۔

وقت گزرتا گیا لیکن عرشیہ اپنی دھن میں سوار پڑھائی سے لاپرواہی دکھاتی رہی۔ ایسی ہی ایک صبح جب والد صاحب نے عرشیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا ''بیٹی تم کب تک اپنا وقت اس طرح برباد کرو گی، کب تک تم پڑھائی پر توجہ نہیں دو گی کیا اسی طرح اپنی زندگی کو برباد کرنا ہے۔ اپنی بہن کو دیکھو وہ تعلیم حاصل کرنے میں دن رات ایک کر رہی ہے اپنی امی کا گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہے لیکن نہ تم پڑھائی پر توجہ دیتی ہو، اور نہ ہی گھر کے کاموں پر ایسا کب تک چلتا رہے گا۔'' عرشیہ نے کہا ''مجھے نہیں کرنی پڑھائی اور نہ ہی گھر کے کام، ان سب کاموں کے لیے ماہی ہے نہ میں کیوں کروں۔ بس میرا نہ پڑھائی میں دل لگتا ہے نہ ہی، گھر کے کاموں میں۔'' عرشیہ کی یہ بے وقوفی تھی یا نادانی وہ ان تمام نصیحتوں کو ایک کان سے سنتی

اور دوسرے کان سے اڑاتی، اسے اپنی زندگی اور ماں باپ کی ہدایتوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ سارا دن عرشیہ گلیوں اور کھیتوں میں گزارتی۔ ادھر دوسری طرف، ماہی دل لگا کر پڑھائی کرتی رہی۔

وقت کی تیز رفتار میں صبح وشام نہ جانے کیسے گزرتے چلے گئے۔ آخر ماہی کی سخت محنت کام آئی اور وہ آج دسویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور دوسرے طرف عرشیہ آٹھویں جماعت میں ہی تعلیم چھوڑ چکی تھی۔ لیکن اس بات کا ذرّہ برابر بھی ملال نہ تھا۔ ماں دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی، کپڑے دھوتی، کھانا بناتی، گھر کے ان گنت کام کرنے میں دن رات لگی رہتی، لیکن عرشیہ ان سب کاموں میں بھی اپنی ماں کی کوئی بھی مدد نہیں کرتی۔ والدین اور ماہی سب ہی عرشیہ کی بڑھتی ہوئی لاپرواہی سے بہت ناراض تھے انھیں لگ رہا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کو عقل اور اپنی ذمہ داری کا احساس ہوجائے گا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ نہ والدین کی نصیحتیں ہی اثر کر رہی تھیں اور نہ ہی ماہی کا پیار۔ اب والدین بھی اس کی طرف سے لاپرواہ ہوگئے اور سارا دھیان ماہی کی زندگی کو سنوارنے میں لگا دیا۔

والدین کی لاپراوہی اور بہن سے دوری کا احساس عرشیہ کو بے چین کر رہا تھا۔ کہ آخر گھر کے سب لوگ مجھ سے دوری کیوں بنائے ہوئے ہیں، غلط باتوں پر ڈانٹ بھی نہیں پڑتی اور نہ ہی مجھ کو نصیحتیں دی جاتی ہیں ان سب باتوں کا جواب پانے کے لیے وہ امی سے سوال کر ہی بیٹھی۔ ''امی آج کل میں دیکھ رہی ہوں، تم ماہی کا زیادہ دھیان رکھتی ہو، اس کے لیے اچھے اچھے کپڑے بناتی ہو، میلے بھی اسے گھمانے لے جاتی ہو، مجھ سے باپو بھی کوئی بات نہیں کرتے اور تم بھی مجھ سے خفا سی رہتی

ہو۔ آخر میں نے ایسا کیا کیا ہے جس کی سزا مجھے دی جا رہی ہے اور سب مجھ سے ناراض ہیں۔'' ماں نے بھی اس کی یہ بات زیادہ غور سے نہیں سنی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ عرشیہ کو بہت احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے۔ ماہی دن رات دل لگا کر پڑھائی کرتی رہی اور دسویں جماعت میں اول درجہ حاصل کیا۔ پورے گاؤں میں اس کے والد نے فخر کے ساتھ یہ خبر سنائی۔ آس پاس کے سبھی لوگ ان کو مبارک دینے آئے۔ ماہی کی سہلیاں اور رشتہ دار اس کے لیے تحفے اور مٹھائیاں لے کر آئے۔ جہاں ایک طرف ماہی تعلیم کے سفر میں آگے بڑھ رہی تھی وہیں دوسری طرف عرشیہ کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا وہ ایک ایسے کنوئیں میں تھی جہاں کوئی راستہ نہ تھا۔

آج گھر میں بہت رونق تھی امی صبح سے ہی گھر کی صفائی اور کھانا بنانے میں لگی ہوئی تھیں ماہی بھی ان کے کام میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ باپو بھی بھینسوں کی صفائی میں لگے ہوئے تھے۔ عرشیہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی یہ سب ماجرہ دیکھ کر حیران ہوگئی اور امی سے معلوم کرنے لگی کہ ''گھر پر کیا کوئی مہمان آرہے

ہیں؟'' امی نے خوش ہو کر بتایا کہ ''آج شہر سے تمہارے ماما آرہے ہیں اور ان کے ساتھ مامی اور بچے بھی آرہے ہیں۔'' عرشیہ نے یہ خبر سن کر زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا، اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر کھیلنے چلی گئی۔ امی کو تھوڑا افسوس تو ہوا لیکن پھر وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ دوپہر کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے ماما کی ٹرین گاؤں کے اسٹیشن پر رکی۔ باپو اور ماہی نے بڑھ کر ماما اور ان کے بچوں سے سامان لے لیا اور تانگے میں سوار ہو کر گھر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں کاروبار سے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور بچے اپنی باتوں میں مگن رہے۔ ماما اور مامی کو ماہی بہت پسند آئی اور اس کی خوش مزاجی اور چھوٹی عمر میں والدین اور گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بہن کی تربیت کو دیکھ کر انھیں فخر کا احساس ہوا کہ وہ ان کی بہن ہے اور اپنی بیٹی کی اچھی پرورش کی ہے۔

سبھی لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوگئے تھے اور باتوں میں مصروف تھے کہ تبھی ماما نے معلوم کیا کہ ''عرشیہ کہاں ہے؟ وہ کیوں گھر پر موجود نہیں ہے۔'' عرشیہ کا نام سن کر ماں کچھ افسردہ ہوگئی اور کہنے لگی وہ تو دن بھر گھر سے باہر اپنی سہیلیوں کے ساتھ رہتی ہے ماما کو یہ بات سن کر بہت افسوس ہوا کہ ایک بہن ایسی ذہین اور ذمہ دار ہے تو دوسری بہن غیر ذمہ دار۔ مامی نے کہا ''آخر ایسا کیوں ہوا نہ پڑھائی کی طرف توجہ اور نہ گھر کے کاموں میں دلچسپی۔'' اس سے پہلے کہ ماں کچھ کہہ پاتی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ رونے لگی۔ مامی نے کہا ''میرا مقصد آپ کو رُلانا نہیں تھا امی سے کچھ بولا نہ گیا تو باپو نے کہا ''ارے ہم نے اس کو کئی بار سمجھایا کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری ہے تعلیم کے بغیر آج انسان کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ایک عقل مند انسان وہی ہے جو تعلیم حاصل کرے، لیکن نہ اس کو میری بات سمجھ میں آئی نہ امی کی، اور نہ ہی بہن کی یہ سب باتیں عرشیہ دروازے سے لگی سن رہی تھی اور آج اس کو احساس ہوگیا تھا کہ گھر میں سب اس کو کتنا پیار کرتے ہیں۔ امی اور باپو کی نصیحتوں میں ہی یہ پیار چھپا ہوا تھا۔ لیکن میں بدعقل یہ سب نہ سمجھ پائی اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے اور دوڑ کر اپنی امی کے گلے لگ کر خوب روئی اور روتے روتے بولی کہ ''امی آج سے جو تم کہو گی وہ میں کروں گی اور اپنی بڑی بہن ماہی کی بات بھی سنوں گی اور پڑھائی بھی کروں گی اور اپنی ساری ذمہ داریاں نبھاؤں گی۔ بس تم مجھے معاف کر دو۔ میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔'' اس پچھتاوے کے آنسوؤں میں اس کو زندگی کی نئی روشنی نظر آئی وہ روشنی جو اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے گی اور ایک ایسا راستہ نظر آئے گا جو اسے ترقی کے راستے سے جوڑ دے گا۔

Nusrat Jahan, Rodgaran
Lal Kuan, Delhi - 110006

مضمون

شمس الاسلام فاروقی

جانے انجانے کیڑے

آج ہم آپ کی ملاقات چند جانے انجانے کیڑوں سے کروا رہے ہیں۔ ہم نے انھیں جانے انجانے اس لیے کہا کہ بعض آپ کے لیے بالکل ہی انجانے ہیں جبکہ بعض کو آپ کم از کم ان کے ناموں سے تو جانتے ہی ہیں۔ ان کیڑوں سے ملنے کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا کہ کیڑے اپنی ساخت اور رہن سہن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنے الگ ہوتے ہیں۔ آپ یہ بھی جان پائیں گے کہ ان میں کتنے آپ کے دوست ہیں اور کتنے دشمن۔

کولمبولا

میں ہوں کولمبولا۔ ایک ننھا منا سا کیڑا جسے آپ خالی آنکھوں سے دیکھ بھی نہ پائیں گے۔ میری شکل وصورت دیکھنے کے لیے آپ کو دوربین کا سہارا لینا پڑے گا۔ میرے اور کچھ دوسری قسم کے کولمبولنس کے جسم 0.25 ملی میٹر سے 6 ملی میٹر تک ہی بڑے ہوتے ہیں۔ ہمارے جسم پَروں سے خالی ہوتے ہیں اور زندگی کے کسی بھی حصے میں ہمارے پَر نہیں نکلتے۔

مگر جناب آپ میرا نام سن کر آخر ہنس کیوں رہے ہیں کیا آپ کو یہ نام کچھ مضحکہ خیز لگتا ہے۔ کیا آپ اپنا نام بھی جانتے ہیں؟ کیا کہا آدمی، انسان اور مانو، مگر صاحب یہ تو اردو اور ہندی زبانوں میں آپ کے نام ہیں۔ میں نے تو آپ کا سائنسی نام پوچھا ہے۔ اگر نہیں معلوم تو میں بتاتا ہوں۔ آپ کا

سائنسی نام ہے ہوموسیپی انیس (Homo Sapiens)۔ کیوں آپ اپنا نام سن کر چونک کیوں گئے۔ یہ ہے نا زیادہ مضحکہ خیز۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ تمام جانداروں کے سائنسی نام کچھ ایسے ہی ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔ دراصل یہ لاطینی اور یونانی زبانوں کے الفاظ سے بنائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں جانداروں کو نام دینے کا رواج شروع ہوا تھا اور اس کے لیے کچھ قاعدے قوانین بنائے گئے تھے اس وقت یہی زبانیں سائنسی زبانیں کہلاتی تھیں۔ نام دینے کا دستور آج بھی وہی ہے۔ یہ نام مشکل تو ضرور لگتے ہیں مگر ان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر کونے میں ایک جاندار بس ایک ہی نام سے جانا جاتا ہے جسے سنتے ہی لوگ فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ بات کس جاندار کے بارے میں ہو رہی ہے جبکہ ہر جاندار مختلف ممالک اور زبانوں میں الگ الگ ناموں سے جانا جاتا ہے جن سے غلط فہمی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اب دیکھیے نا عام مکھی جانے کتنے ناموں سے جانی جاتی ہے جیسے مکھی، گھریلو مکھی، گلس، فلائی وغیرہ وغیرہ مگر اس کا سائنسی نام دنیا کے ہر حصے میں صرف اور صرف مُسکا ڈومیسٹکا Musca Demestica ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی بھی زبان بولنے والا جب یہ نام سنتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ بات گھریلو مکھی کی ہو رہی ہے۔

چلیے آپ نے میرے نام کولمبولا پر ہنسنا بند کیا۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں کولمبولا بھی میرا ذاتی نام نہیں ہے۔ وہ سنیں گے تو آپ گھبرا ہی جائیں گے۔ کولمبولا تو دراصل اس گروہ کا نام ہے جس سے میرا اور بہت سی دوسری قسموں کا تعلق ہے۔ آپ چاہیں تو مجھے اسی نام سے پکار سکتے ہیں۔

کولمبولا کی بعض قسمیں گول مٹول جبکہ دوسری کسی قدر لمبوتری ہوتی ہیں۔ ہمارے سر کے حصے میں مرکب آنکھیں نہیں ہوتیں لیکن ان کی جگہ چھوٹے چھوٹے رنگین دھبے نظر آتے ہیں۔ ہمارے جسم میں سینے اور پیٹ کے حصوں میں فرق کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ سینے کے حصے کو صرف تین جوڑی پیروں کی موجودگی ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ تیسرے پیر کے بعد ہی پیٹ شروع ہو جاتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ چھ قطعے (حصے) ہوتے ہیں۔ پہلے حصے پر نیچے کی طرف ایک پھولا ہوا غبارہ نما عضو ہوتا ہے جس کی مدد سے کسی بھی سطح پر ہمیں خود کو چپکانے میں مدد ملتی ہے جبکہ تیسرے حصے کے عضو سے جو دوشاخہ ہوتا ہے کسی بھی چیز پر پکڑ بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ چوتھے حصے پر ایک دم جیسا لمبوترا عضو ہمیں زمین سے اوپر اچھلنے میں مدد کرتا ہے۔ اس عضو کی وجہ سے ہمیں ایک عام نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ نام ہے اسپرنگ ٹیل۔ اسپرنگ کے معنی ہے اچھلنا اور ٹیل دُم کو کہتے ہیں۔ یہ لمبوترا عضو آرام کی حالت میں جسم سے لگا رہتا ہے مگر جب کبھی طاقت کے ساتھ جسم سے الگ ہو کر زمین سے ٹکراتا ہے تب ہم بہت اونچائی تک اچھل جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہمارا جسم تو بس چند ملی میٹر ہی بڑا ہے مگر ہم اسپرنگ ٹیل کی مدد سے 75 سے 100 ملی میٹر تک آسانی سے اچھل سکتے ہیں۔

ہم ہر نم جگہ پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ آپ ہمیں گملے ہٹا کر ان کے نیچے کی نم جگہ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم گلی سڑی پتیوں کے درمیان، کھاد یا زمینی درازوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہماری کچھ اقسام پانی کی سطح پر تیرتی بھی نظر آتی ہیں اور بعض قسم کے کولمبولا تو پہاڑوں پر جمی برف پر بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے جسم مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں۔ بعض دودھ کی طرح سفید تو دوسرے نیلے، پیلے، کتھئی، اودے یا

سیاہی مائل۔ چونکہ ہماری تعداد کروڑوں میں ہوتی ہے اور جسم رنگین، اس لئے ہم رنگین دھبوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ بعض ماہرین نے پہاڑوں پر جمی برف پر ہماری تصاویر کھینچی ہیں۔ ہم اس پر بڑے بڑے رنگین دھبوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

پھولوں کا زردانہ، کائی اور اس کے اسپورس (بیج) ہماری غذا ہیں جبکہ ہم خود بھی دوسرے جانداروں کی غذا بنتے ہیں اور یہ ہماری زندگی کا ایک اہم مقصد ہے۔ دوسرے جانداروں کو غذا فراہم کرنے کے علاوہ زمین کی زرخیزی بڑھانے میں بھی ہمارا بڑا ہاتھ ہے۔

سلورفش

میرا شمار بھی ان چھوٹے کیڑوں میں ہوتا ہے جو بے پروا لے ہیں۔ سلورفش میرا انگریزی زبان کا نام ہے۔ ویسے آپ مجھے اور میری دوسری قسموں کو ہمارے گروہ کے مائنس نام تھائی سے نیوا the ysanura سے پکار سکتے ہیں۔ انگریزی زبان کا میرا نام ظاہر کرتا ہے کہ میرا رنگ چاندی کی طرح سفید ہے اور جسم مچھلی سے ملتا جلتا۔ آپ مجھے کتابوں کے صفحات یا کپڑوں کے درمیان چھپا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری کچھ دوسری اقسام مٹی، گلی سڑی پتیوں یا لکڑی، چیونٹیوں اور دیمک کے بلوں اور ایسی ہی دوسری نم جگہوں پر پائی جاتی ہیں۔ میرے لیے دراصل کتابیں یا کلف لگے ہوئے کپڑے غذا کا کام بھی کرتے ہیں۔ اگر آپ کچھ عرصے کے لیے ان سے غافل ہو جائیں تو میں انہیں برباد کر ڈالتا ہوں۔

میرا جسم لمبوترا ہوتا ہے جو سینے کے حصے میں کچھ چوڑا لیکن

پیٹ کی طرف پتلا ہوتا جاتا ہے جس سے پیٹ کا آخری قطعہ کسی قدر نوکدار ہو جاتا ہے۔ سر چھوٹا ہوتا ہے جس پر دو لمبے لمبے اینٹنا ہوتے ہیں۔ بہت سی آنکھیں ہوتی بھی ہیں اور بعض قسموں میں نہیں بھی ہوتیں۔ جسم کی لمبائی عام طور سے 7 سے 19 ملی میٹر تک ہوتی ہے اور وہ اوپر نیچے سے بہت زیادہ دبا ہوا یعنی چپٹا ہوتا ہے۔ پیروں کے مختلف حصے بھی جسم ہی کی طرح چپٹے ہوتے ہیں۔ جسم کی یہ ساخت مجھے کتابوں کے صفحوں اور کپڑوں کے درمیان تیزی سے سرسراتے ہوئے حرکت کرنے میں مدد کرتی ہے۔ کولمبولا ہی کی طرح میرے سینے اور پیٹ کے حصوں کے درمیان بھی فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آخری پیر کے فوراً بعد پیٹ شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں قطعوں کی تعداد کولمبولا سے بہت زیادہ یعنی 11 ہوتی ہے۔ مچھلیوں کی طرح میرے پورے جسم پر بھی اسکیلز ہوتے ہیں جن کی وجہ سے جسم خاصا چکنا اور چکمدار دکھائی دیتا ہے۔ کبھی مجھے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایئے۔ دیکھیے میں کس طرح لہرا کر بالکل مچھلی کی طرح پھسلتا ہوا آپ کے ہاتھ سے نکل جاتا ہوں۔ میرے پیٹ کے آخری قطعے پر تین لمبے لمبے بال دار ریشے ہوتے ہیں۔ بھاگتے وقت انہیں لہرانے سے میری رفتار میں تیزی آجاتی ہے۔ ہماری مادائیں درمیانی ریشے کو جو ایک ٹیوب کی طرح ہوتا ہے انڈے دینے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

بھمبھیری

میں بھمبھیری کہلاتی ہوں۔ آپ نے نہر کے کنارے مجھے اڑتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ انگریزی زبان میں مجھے ڈریگن فلائی کا نام دیا گیا ہے جو بالکل میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا میں آپ کو دیکھنے میں اژدھے جیسی خوفناک لگتی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے بنانے والے نے مجھے خاصا خوبصورت اور حسین بنایا ہے۔ آپ نے میری جیسی بڑی بڑی حسین آنکھیں نہیں دیکھیں ہیں۔ میرا پورا سرا نہی مرکب آنکھوں کا بنا ہوتا ہے جس میں کم از کم پچاس ہزار لینس ہوتے ہیں۔ جب میری آنکھوں پر روشنی پڑتی ہے تو وہ ہیرے کی طرح جگمگانے لگتی

ہیں۔ لگتا ہے میری ان آنکھوں کو دیکھ کر ہی کسی نے مجھے اژدھے جیسا بنادیا ہوگا اور تب ہی سے میں ڈریگن فلائی کہلانے لگی۔ مگر آپ کو نہیں لگتا یہ نام میرے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ آنکھوں سے جو سر کا حصہ بچ جاتا ہے اس پر دو چھوٹے چھوٹے بال جیسے اینٹینا ہوتے ہیں۔ میرا سر ایک بے حد پتلی گردن کے ذریعے سینے سے جڑا ہوتا ہے جس کی وجہ سے میں اپنے سر کو جس طرف چاہتی ہوں بڑی آسانی سے گھما سکتی ہوں۔ دوسرے کیڑوں کو یہ آسانی حاصل نہیں ہے۔

سینے کی اوپری سطح پر دو جوڑی بڑے بڑے پر ہیں، انتہائی باریک اور شفاف جن کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے۔ اگلے اور پچھلے پر تقریباً ایک سائز کے ہوتے ہیں اور ان پر باریک رگوں کا پھیلا ہوا جال بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔ میرے پروں پر جب روشنی پڑتی ہے تو ان میں چمک پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض بھمبھیروں کے پر بے رنگ مگر کچھ کے رنگین بھی ہوتے ہیں مگر سب ہی میں روشنی پڑنے پر ایک خاص زاویے سے دھنک جیسے رنگ نظر آتے ہیں۔ پروں کی وجہ سے میرا قد خاصا بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اگر پھیلے ہوئے پروں کو باہری کناروں سے ناپیں تو لمبائی لگ بھگ 190 ملی میٹر ہوجاتی ہے۔ میں اپنے پروں کی مدد سے بہت تیزی سے اڑسکتی ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک گھنٹے میں سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہوتا۔

میرے سینے کے نیچے کی طرف تین جوڑی لمبے لمبے پیر ہیں جب میں اڑتے اڑتے بہت سے مچھروں، مکھیوں اور بھُنگوں جیسے کیڑوں کا شکار کرتی ہوں تو انہیں حفاظت سے رکھنے کے لیے اپنے اگلے پیروں کو منہ کے نیچے جوڑ کر ایک ٹوکری سی بنالیتی ہوں اور پھر جب بھی موقع ملتا ہے انہیں چیر پھاڑ کر کھاتی رہتی ہوں۔ اڑتے وقت لوگوں کو میرے پر بہت بھلے لگتے ہیں۔ ان کا خیال ہے میں ان کی مدد سے کسی ہیلی کاپٹر کی طرح آسمان میں اڑتی نظر آتی ہوں۔ مگر اپنے پروں کی ایک خاص خرابی صرف مجھے ہی معلوم ہے۔ میرے یہ پر ہمیشہ ہی پھیلے رہتے ہیں۔ میں چاہے اڑ رہی ہوں یا کہیں بیٹھ کر آرام کررہی ہوں، یہ پر ہر حالت میں کھلے ہی رہتے ہیں۔ دوسرے کیڑوں کی طرح ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ جب استعمال نہ ہوں تب سمٹ کر جسم کے اوپر آجائیں۔ لوگوں کو اچھے لگیں مگر بھئی میرے لیے تو بڑی پریشانی ہوجاتی ہے۔

سینے سے جڑا میرا پیٹ بہت ہی پتلا لیکن لمبا ہے۔ میرے جسم کا سب سے نازک حصہ یہی پیٹ ہے۔ عام طور پر اس کا رنگ کتھئی یا کالا ہوتا ہے مگر بعض قسموں میں اس پر بھی رنگین دھبے یا دھاریاں پڑی ہوتی ہیں جو جسم کو بہت حسین بنادیتی ہیں۔

میں پانی کی سطح پر یا پھر ایسے پودوں کے پتوں پر انڈے دیتی ہوں جو پانی کے کنارے ہوں۔ انڈوں سے نکلنے والے لاروے پانی ہی میں رہتے ہیں اور وہیں پل کر بڑے ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خود بھی پانی میں رہنے والے مختلف جانداروں، جیسے مچھلیوں وغیرہ کی غذا بنتے رہتے ہیں مگر بڑے ہونے کے دوران وہ خود بھی کئی طرح کے جانداروں کو اپنی غذا بناتے ہیں جن میں مچھروں کے لاروے بہت خاص ہیں۔ میرے لاروے انہیں کھا کھا کر ان کی تعداد میں بڑی کمی کردیتے ہیں اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں اور میرے بچے دونوں ہی انسانوں کے دوست ہیں جو ان کے موذی دشمنوں کا صفایا کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

Shamsul Islam Farooqui
90-B, AahataTalib
Noor Nagar, New Delhi - 25

نازمین اکرم خان

موتی ہیں بیٹیاں

ریشم کی طرح نرم سی ہوتی ہیں بیٹیاں
اوروں کا درد دیکھ کے روتی ہیں بیٹیاں
بیٹا تو ایک گھر کو ہی روشن کرے مگر
دو گھر کی روشنی کو بڑھاتی ہیں بیٹیاں
علم وہنر میں ہم بھی تو بیٹوں سے کم نہیں
احساس ہر گھڑی یہ دلاتی ہیں بیٹیاں
گہرائی ان کے پیار کی ناپے گا کیا کوئی!
کوزے میں جیسے دریا سموتی ہیں بیٹیاں
جو مرد ظلم کرتے ہیں وہ یہ بھی جان لیں
ان کے جنم کا درد بھی سہتی ہیں بیٹیاں
تو ان میں کوئی فرق نہ کرنا کبھی ندیمؔ
بیٹے اگر ہیں ہیرے تو موتی ہیں بیٹیاں

Nazmeen Akram Khan
Nagar Palika School No 24
Bhusaval 425201

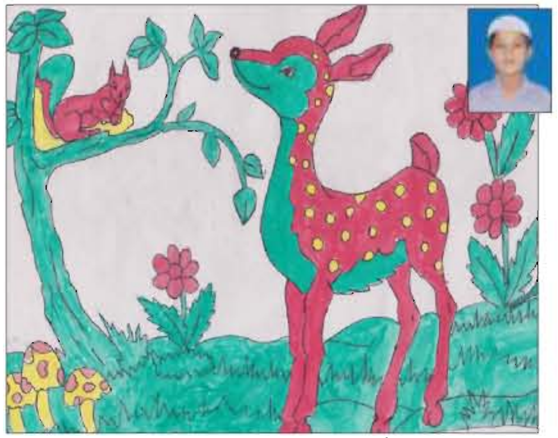

ڈرائنگ: فیضان احمد، درجہ 5، نگینہ

ڈرائنگ: رانی بی افضل، زیڈ پی اردو اسکول، دھولے، مہاراشٹرا

ڈرائنگ: ثانیہ رفیق پنجاری، درجہ 4، مہاراشٹر

ارشد حسین

بھوتوں کی دنیا کی سیر

میں اور میرے دوست پانی کے ایک جہاز میں کسی سمندر کی سیر کے لیے جا رہے تھے ہم لوگ سمندر میں کچھ دور ہی گئے تھے کہ اچانک بادل گرجنے لگے اور بارش ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد رات ہونے والی تھی۔ جہاز ہمارے قابو سے باہر ہونے لگا۔ سمندری طوفان آنے کا اندیشہ تھا۔ ہم لوگوں نے کسی طرح جہاز کو سنبھالے رکھا لیکن اچانک ہمارا جہاز ایک بڑی سی چٹان سے ٹکرا گیا اور میں جہاز سے دور جا گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو میری آنکھ کھلی اور میں نے دیکھا کہ جہاز ڈوب چکا تھا اور میرے دوستوں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نے جب چاروں طرف دیکھا تو مجھے ایک غار ملا۔ میں نے سوچا کہ یہاں جا کر دیکھتا ہوں شاید مجھے یہاں سے کوئی مدد مل جائے۔ میں جب وہاں گیا تو میں نے دیکھا کہ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مجھے تھوڑی سی روشنی نظر آئی تو میں اور آگے بڑھا مجھے کسی کے میری طرف آنے کی آواز ملی تو میں ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے ایک عجیب آدمی کو دیکھا جس کے تین ہاتھ دو ناک اور ایک آنکھ تھی۔ اس کا چہرہ عجیب سا تھا۔ شاید

اسے میرے وہاں ہونے کا پتا چل گیا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ بھوت ہے۔ میں ڈر گیا تھا اس نے کہا کہ جو بھی یہاں آیا ہے وہ میرے سامنے آجائے۔ میں ڈر گیا مجھے لگا کہ میں اگر اس کے سامنے گیا تو وہ مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ یہاں جو آتا ہے وہ واپس نہیں جا سکتا۔ یہ سن کر میں نے اس کے سامنے جیسے ہی جانے کی کوشش کی وہ اچانک غائب ہوگیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بھوت ہی تھا۔ میں اور آگے بڑھا تو اسی طرح کے ایک اور بھوت کو دیکھا۔ میں اسی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایسی جگہ پہنچا جہاں میں نے عجیب و غریب قسم کے بھوتوں کو دیکھا۔ ان بھوتوں کا ایک راجہ بھی تھا جو بہت خطرناک تھا۔ ان کے کھانے بہت ہی شاندار قسم کے تھے۔ مجھے بھی بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں ان لوگوں کے سامنے آ گیا اور میں نے کہا کہ مجھے بھوک لگی ہے کیا تم لوگ مجھے کھانا دو گے۔ بھوتوں کے راجہ نے کہا کہ تم ہماری دنیا کے بھوتوں کی طرح تو نہیں لگتے۔ میں نے کہا کہ میں ایک انسان ہوں اور میں نے اپنے ساتھ ہوئے سارے واقعات ان کے سامنے بیان کر دیئے۔ راجہ نے کہا کہ اس لڑکے کو اس کے کھانے کے لائق کھانے دیئے جائیں۔ مجھے ایک شاندار

ٹیبل پر بیٹھا دیا گیا اور ایک بھوت نے کہا کہ انسانوں کے کھانے لائق کھانے حاضر ہوں اور میرے سامنے ہر طرح کے کھانے حاضر ہو گئے اور میں نے اپنا پیٹ بھر لیا اور میرے سونے کے لئے مخمل کا بستر لایا گیا میں اس پر آرام کی نیند سو گیا۔ دوسرے دن میں جب جگا تو اسی طرح میرا استقبال کیا گیا۔ لیکن وہاں کچھ خراب قسم کے بھوت بھی تھے۔ انہوں نے راجہ کو میرے خلاف بھڑکا دیا۔ راجہ نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔ اگر تم نہیں گئے تو میرے بھوت تمہیں کھا جائیں گے۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا تو وہ مجھے ایک عجیب سے گھر میں لے گئے اور مجھے بھوتوں نے گھیر لیا تا کہ مجھے کھا سکیں۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے اٹھانے کے لئے کسی نے میرے منہ پر پانی مارا۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اپنے بستر پر پایا۔ تب مجھے یقین ہوا کہ میں نے ایک بُرا خواب دیکھا ہے۔ چاہے جو بھی ہو اسی بہانے میں نے بھوتوں کی دنیا کی سیر بھی کر لی۔

Arshad Hussain
Class VIII, Kendva High School
Post Kulti, Dist. Bardavan, 713343

خان ندیم عبدالقیوم

جانور اور انسان

کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ اس کا بیٹا بھی تھا۔ جب شیر بوڑھا ہوگیا تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ بیٹا اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں میں مرنے کے قریب ہوں۔ بیٹا تم اب اس جنگل کے اگلے بادشاہ ہو۔ کسی سے ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں لیکن انسان سے بچتے رہنا۔ اللہ نے اسے بڑی طاقت دی ہے۔ بوڑھے شیر کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا جنگل کا راجہ بنا۔ سب جانور اس سے ڈرتے مگر وہ اپنے باپ کی آخری بات کو بھولا نہیں تھا۔ وہ آدمی کو دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر کیا بلا ہے جس سے بچنے کی میرے باپ نے نصیحت کی تھی۔ ایک دن وہ آدمی کی تلاش میں نکلا بہت دیر تک ادھر اُدھر پھرنے کے بعد اسے ایک گھوڑا ملا۔ بہت چالاک اور تیز دوڑنے والا۔ اس کی تیزی کو دیکھ کر شیر نے سوچا شاید یہی آدمی ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس

کے پاس گیا۔ ادب سے کھڑے ہو کر پوچھنے لگا۔ بھیا کیا تم آدمی ہو۔ گھوڑا شیر کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور بولا۔ اے جنگل کے راجہ میں تو گھوڑا ہوں۔ آدمی کو اللہ نے سب سے اچھا بنایا ہے اسے بڑی عقل دی ہے۔ ہم سب کو اس کی خدمت کے لیے بنایا ہے۔ وہ ہم سے جیسا چاہتا ہے کام لیتا ہے۔ شیر کے بچے نے آدمی کو بہت تلاش کیا مگر آدمی نہیں ملا اور وہ واپس گھر چلا گیا لیکن راستے میں اسے ایک بڑھئی ملا جو لکڑی کاٹ رہا تھا۔ شیر کے بچے نے پوچھا یہ بھلا آدمی کیا ہوگا؟ چلو اس سے پوچھ لیں کہ اس نے آدمی کو دیکھا ہے یا نہیں۔ وہ بڑھئی کے پاس گیا اور پوچھا کیا تم نے کبھی آدمی کو دیکھا ہے؟ پہلے تو آدمی ڈر گیا پھر بولا میں ہی آدمی ہوں۔ یہ سن کر شیر ہنسنے لگا اور بولا کیا تم ہی ہو ''جس سے بچنے کے لیے میرے باپ نے نصیحت کی تھی۔ تمھیں تو میں ایسے ختم کر دوں گا'' یہ کہہ کر شیر آدمی کو مارنے کے لیے آگے بڑھا تب آدمی نے کہا ذرا ٹھہرو سچ مچ اللہ نے تمھیں بڑی طاقت دی ہے۔ لیکن اس نے مجھے بڑی عقل دی ہے۔ آدمی بولا شیر تم میں طاقت ہے تو اس لکڑی کے دو حصے کر کے دکھاؤ۔ شیر نے یہ سن کر زور سے لکڑی کے دو حصے کرنے کی کوشش کی لیکن لکڑی کے دو حصے کرتے وقت اس کا ہاتھ لکڑی میں پھنس گیا۔ اب آدمی نے کہا دیکھا تم نے۔ آدمی ہے تو بہت چھوٹا اور کمزور مگر اللہ نے آدمی کو وہ چیز دی ہے جو تم جانوروں کو نہیں دی، وہ ہے عقل۔ اس سے کام لے کر آدمی بڑے سے بڑا کام کرتا ہے اور اپنے بنانے والے کا شکر ادا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقل اور سوجھ بوجھ ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔

Khan Abdul Qayyum
Anjuman Reyazul Islam High School
Gautam Nagar, Gondi, Mumbai 34

عبدالرحیم نشتر

رم جھم رم جھم سا موسم

رم جھم رم جھم سا موسم
آئی رے، آئی رے
مستی میں پروائی رے
تو بھی آجا بھائی رے
کھا لے دودھ ملائی رے

موسم کیا مستانہ ہے
پر اسکول بھی جانا ہے
بارش ہوگی رستے میں
تھوڑا بھیگ بھی جانا ہے

تتلی اڑ کے آتی ہے
اپنے پر پھیلاتی ہے
چٹکی میں دھر لیتا ہوں
بے چاری مر جاتی ہے

بیر بہوٹی پکڑوں گا
اک شیشی میں بھر لوں گا
امّی چانٹا مارے گی
رونی صورت کر لوں گا

شام کو ہم گھر آتے ہیں
بستوں کو ہم لٹکاتے ہیں
دھوم دھڑاکا کرتے ہیں
سارا گھر دہلاتے ہیں

بجلی گل ہو جاتی ہے
تاریکی چھا جاتی ہے
ٹی وی چپ ہو جاتا ہے
باجی جھلّا جاتی ہے

رم جھم،رم جھم سا موسم
ماں کی دعاؤں جیسا ہے
کتنا پیارا لگتا ہے
کتنی اداؤں والا ہے

Abdul Raheem Nashtar
Plot No. 7, Behind Markazi
Teachers Colony
Jafar Nagar, Nagpur 440013

تیسری قسط

اُلٹا دَرَخت

کرشن چندر

اب تک آپ نے پڑھا کہ ایک موچی کا تھوڑا سا بے وقوف مگر منھ پھٹ اور بے روزگار بیٹا یوسف اپنی ماں کے کہنے پر بادشاہ کے پاس کام مانگنے گیا تو ہکلے اور ظالم بادشاہ نے اس کے خوب صورت باغیچے پر ہی قبضہ کرلیا۔ وہاں ایک نک چڑھی شہزادی ملی۔ اس نے یوسف کی ماں کا کنواں چھین لیا۔ اب غریب یوسف کے پاس ماں کے علاوہ ایک جھونپڑی اور ایک گائے رہ گئی۔ ماں نے کہا گائے بیچ دو ورنہ بھوکے مر جائیں گے۔ بازار میں ایک شخص نے اسے صرف تین بیج دے کر گائے لے لی اور کہا یہ بیج ایک ساتھ بوئے گا تو ایک ایسا درخت اگے گا جس کی اونچائی آسمان تک ہوگی۔ ان میں سے

دو بیج ضائع ہو گئے۔ یوسف بڑا پریشان ہوا اور اس نے بچا ہوا بیج باغیچے کی زمین میں دبا دیا۔ رات کو خوب بارش ہوئی اور صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بیج والی زمین میں ایک عجیب درخت اگا تھا جس کی جڑیں زمین پر تھیں اور تنا اور شاخیں زمین کے اندر اتر رہی تھیں۔ ماں کے منع کرنے پر بھی یوسف اس درخت پر نیچے کی طرف چڑھنے لگا۔ کافی نیچے اترنے پر وہ آوازوں کے ایک شہر میں پہنچ گیا۔ ایک سرگوشی جیسی آواز نے اسے شہر کی کہانی سنائی اور بتایا کہ یہاں تمام آوازوں کو آسمان جتنے اونچے گنبد میں قید کر لیا گیا ہے۔ مگر ان قیدی آوازوں نے وہاں سے بادشاہ کے محل تک ایک سرنگ بنائی اور اس میں فتیلہ بن کر گھس گئیں۔ یوسف کا کام تھا اس فتیلے کو آگ لگانا۔ اس نے فتیلے کو آگ دکھائی اور تیزی سے الٹے درخت پر جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں آوازوں کا شہر تباہ ہو گیا اور یوسف درخت پر نیچے چڑھنے لگا۔ تین دن تین رات چڑھنے کے بعد اندھیرے میں کسی نے اسے درخت سے اتار لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوا میں اڑ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس ہاتھ نے اسے ایک بہت بلند اور بڑے دروازے پر اتار دیا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ایک دیو بھی اس کے نیچے سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ یوسف تو خیر آدمی تھا۔ بڑی آسانی سے اندر چلا گیا۔ دروازے کی محراب پر لکھا تھا: کالے دیو کا شہر۔ اس کے بعد یوسف درخت پر چڑھتا یا یوں کہ لو کہ زمین کے اندر اترتا چلا گیا جہاں ہر منزل پر اسے ایک نئی دنیا ملی...

درخت کی ٹہنی پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ پھر درخت کے تنے پر آ پہنچے۔ موہن نے یہ بڑی ہوشیاری کی کہ وہ ایک ٹارچ لے آیا۔ اس ٹارچ کی روشنی میں دونوں دوست درخت کے اوپر چڑھتے گئے آگے موہن پیچھے پیچھے یوسف تا کہ موہن اگر کبھی درخت سے گرنے لگے تو پیچھے سے یوسف اسے سنبھال لے۔ موہن اپنے انگوٹھے کی مدد سے بڑی محنت اور مشکل سے درخت پر چڑھتا جاتا اور یوسف اسے ٹارچ دکھاتا جاتا تھا تھوڑی دور تاریکی میں چڑھنے کے بعد دھیمی دھیمی روشنی نظر آنے لگی۔ ایسی روشنی جیسی چاندنی رات میں ہوتی ہے۔ آگے جا کے انہوں نے دیکھا کہ درخت کی ایک اونچی ڈال پر ایک پنجرا لٹکا ہوا ہے اور اس میں چاند بند ہے۔

اس پنجرے کے پاس ایک عجیب شکل کا دیو بیٹھا ہے جس کی رنگت چاندی کی سی ہے۔ اس دیو کی آنکھیں چاندی کی تھیں اور جب وہ بات کرتا تھا تو اس کے منہ سے لفظوں کے بجائے روپے نکلتے تھے اور یہ روپے کھنکھناتے ہوئے عجیب سی آواز پیدا کرتے ہوئے نیچے ایک بہت بڑی چاندی کی طشتری میں گرتے جاتے تھے۔ اس طشتری کے بیچ میں ایک بڑا سوراخ تھا جس میں ایک نلی لگی تھی جس کا ایک سرا طشتری میں اور دوسرا سرا اس دیو کی ناف میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ روپے دیو کے ہونٹوں سے گرتے، آواز پیدا ہوتے ہوئے طشتری میں کھنکھناتے اور سوراخ سے غائب ہو کر نلی میں ہوتے ہوئے دیو کی ناف کے اندر چلے جاتے۔ یوسف نے ان گرتے ہوئے روپوں کو جب ہاتھ سے پکڑنا چاہا تو اس نے 'سی' کر کے جلدی سے ان روپوں کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ روپے آگ کی طرح تپ رہے تھے۔ یوسف اپنے ہاتھ کی

بچوں کی دنیا

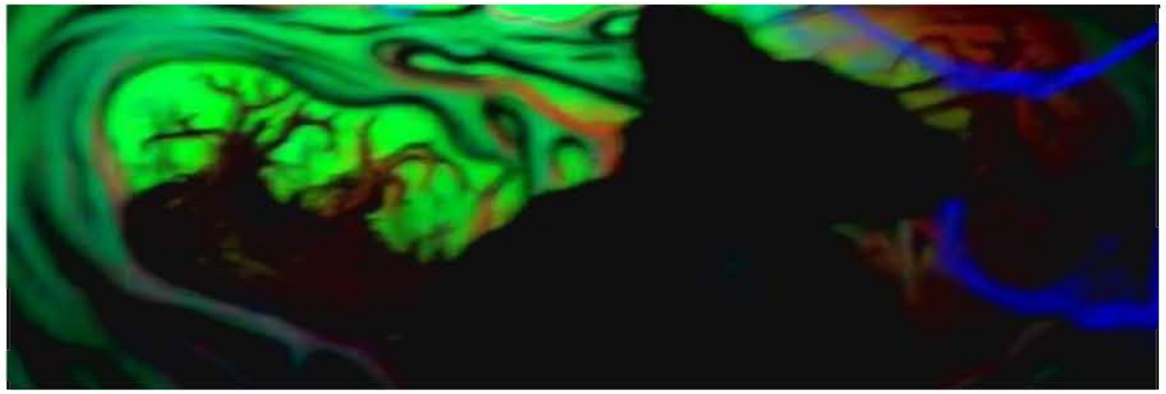

طرف دیکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ جل گیا تھا، ہتھیلی پر جگہ جگہ چھالے پڑ گئے تھے۔

موہن نے پوچھا "اب تم درخت پر کیسے چڑھو گے؟"

دیو نے ہنس کر کہا "آگے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری دنیا میں رہو۔"

موہن نے پوچھا "تمہاری دنیا کون سی ہے؟"

دیو نے اپنے قریب ہی رکھے ایک بہت بڑے ڈھول کو اٹھا کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ یہ ڈھول بڑا عجیب و غریب تھا اور ہڈّیوں اور کھال کا بنا ہوا تھا۔ اور جو پردے ہوتے ہیں وہ دو رنگ کے تھے۔ ایک طرف کی کھال کالی تھی اور دوسری طرف کی سفید۔

یوسف نے پوچھا "اے بڑے دیو، اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

چاندی کے دیو نے بڑی نخوت سے کہا "بول کیا کہتا ہے تیری جان بخش دی ہم نے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار، بول کیا بکتا ہے؟"

یوسف نے کہا "آپ کا یہ ڈھول لکڑی کی بجائے ہڈیوں کا کیوں ہے؟"

دیو نے کہا "لکڑی بہت مہنگی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے ڈھول کو انسان کی ہڈیوں سے تیار کیا ہے اور اس پر چمڑا بھی انسان کا منڈھا ہوا ہے۔ کیونکہ دوسرے جانوروں کا چمڑا بہت مہنگا آتا ہے۔"

موہن نے پوچھا "مگر ایک خول کالا ہے اور دوسرا سفید ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

دیو نے کہا "ایک کالے آدمی کا چمڑا ہے۔ دوسرا سفید آدمی کا چمڑا ہے۔ مگر میں دونوں کو ایک ہی چھڑی سے پیٹتا ہوں۔"

پھر چاندی کے دیو نے ڈھول کو پیٹتے ہوئے چلانا شروع کر دیا۔

"ڈم۔ ڈم۔ ڈم آ جاؤ۔ جادو کی دنیا دیکھو۔ انسان کے انبار دیکھو۔ لاؤ صرف چار آنے ڈم۔ ڈم ڈم۔"

یوسف نے کہا "مگر ہمارے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

موہن نے کہا "نہیں میری جیب میں آٹھ آنے ہیں۔"

موہن نے دیو کو آٹھ آنے دیے اور جادو کی دنیا کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر جا کر یوسف اور موہن نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا لق و دق صحرا ہے۔ زمین بنجر ہے۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے ہیں۔ صحرا کے بیچ میں ایک لمبا سا راستہ ہے۔ جس پر انسان کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں اور اس راستہ پر لاکھوں انسان

آہ وزاری کرتے ہوئے ایک دوسرے کو ڈھکیلتے ہوئے، آگے چل رہے ہیں۔ ان دونوں لڑکوں نے دیکھا کہ ہر انسان کے پاؤں میں سونے کی زنجیر پڑی ہوئی ہے اور یہ زنجیر اگلے آدمی کی زنجیر سے بندھی ہوئی ہے۔ یہ لوگ بہت کمزور نظر آتے تھے۔ ان سے بڑی مشکل سے چلا جاتا تھا اور بہت سے لوگ تو ایسے تھے کہ ان کے جسم کی پسلیاں تک الگ الگ نظر آتی تھیں۔ یوسف نے پوچھا ''تم لوگ کون ہو؟''

ایک آدمی نے کہا ''ہم لوگ سونے کے دیو کے غلام ہیں۔ اس نے ہم کو قید کر رکھا ہے۔''

یوسف نے کہا ''سونے کا دیو کہاں ہے؟''

''وہ تم کو آگے ملے گا؟''

''آگے کہاں؟''

''جہاں یہ راستہ ختم ہوتا ہے۔''

جہاں یہ راستہ ختم ہوتا تھا وہاں پر واقعی سونے کا دیو بیٹھا تھا۔ اس کی صورت شکل چاندی کے دیو سے ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جب وہ بات کرتا تھا تو اس کے منہ سے روپوں کی بجائے اشرفیاں گرتی تھیں اور چاندی کی طشتری کی بجائے سونے کی طشتری میں گر کے دیو کی ناف میں غائب ہو جاتی تھیں۔

دیو نے لڑکوں سے کہا ''تمہارا ٹکٹ کہاں ہے؟''

لڑکوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے ٹکٹ دکھائے۔ سونے کے دیو نے کہا ''اچھا ہے تمہارے پاس ٹکٹ ہیں۔ ورنہ میں تمہیں بھی غلام بنا لیتا۔ اب میرا تماشا دیکھو۔''

اتنا کہہ کر دیو نے اپنے سامنے کھنچے ہوئے ایک پردے کو ہٹایا، اور دونوں بچوں نے دیکھا کہ سامنے لق و دق صحرا میں ایک بہت بڑی دیوار کھڑی ہے اور یہ دیوار ساری کی ساری سونے کی ہے۔ اتنی بڑی سونے کی دیوار انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی مگر یہ دیکھ کر ان کو اور بھی اچنبھا ہوا کہ اس دیوار کی بنیادوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے اور چھوٹے چھوٹے دیوزادے ان طلائی زنجیروں کو کھینچ کھینچ کر ان سوراخوں میں ڈال رہے ہیں جو انسانوں کے پیروں میں بندھی ہوئی تھیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' موہن نے پوچھا۔

دیو نے کہا ''یہ میں سونے کی دیوار اگا رہا ہوں۔''

''سونے کی دیوار بھی اگتی ہے؟'' موہن نے حیران ہو کر پوچھا۔

دیو نے کہا ''جتنی دیر تمہیں آئے ہوئے ہوئی ہے۔ اتنی دیر میں یہ دیوار دو فٹ اونچی ہو گئی ہے۔ دیکھو غور سے دیکھو، تمہیں دیوار اگتی ہوئی معلوم ہو گی۔''

بچوں نے غور سے دیکھا۔ واقعی دیوار بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یوسف نے دیوزادوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''مگر یہ جو دیوزادے ہیں۔ یہ وہاں سونے کی دیوار کے پاس کیا کر رہے ہیں؟''

''اس کی بنیادوں کو سینچ رہے ہیں۔''

یکا یک دیو نے تالی بجا کر کہا ''کھل سم سم'' اور دیوزادوں نے اپنی طلائی زنجیروں کو سوراخ میں ڈال دیا۔ اور موہن اور یوسف نے دیکھا کہ وہ طلائی زنجیریں نہ تھیں، طلائی نلیاں تھیں جن میں سے انسانی خون بہہ کر سونے کی دیوار کے سوراخوں میں جا رہا تھا۔

یوسف نے گھبرا کر کہا ''مگر یہ تو انسانی خون ہے۔''

دیو نے ہنستے ہوئے کہا ''مگر یہ بھی تو دیکھو کہ دیوار کتنی اونچی ہو گئی ہے۔''

☆☆☆

یوسف اور موہن وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے جادو کی دنیا کے بالکل دوسرے حصے میں نکل آئے۔ یہاں پر ایک چبوترے کے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ چبوترے کی طرف دیکھ دیکھ کے بولی دے رہے تھے۔

''دس ہزار۔''

''تیس ہزار''

''چالیس ہزار''

موہن نے پوچھا ''کیا بات ہے؟ کس چیز کی بولی لگ رہی ہے۔''

یوسف نے کہا ''آؤ آگے بڑھ کے دیکھیں۔''

چبوترے کے قریب جا کے انہوں نے دیکھا کہ ایک لوہے کے ستون سے لوہے کی زنجیروں سے بندھی ہوئی ایک بڑی ہی خوبصورت شہزادی ہے۔ اس کے نازک ریشمی بال کمر تک لٹک رہے ہیں۔ اس کی کنول کی ڈنڈی کی طرح لمبی گردن ایک طرف جھکی ہوئی ہے اور آنسو اس کی آنکھوں سے برابر بہہ رہے تھے۔ مگر یوسف اور موہن کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے جو آنسو گر رہے ہیں۔ دراصل وہ آنسو نہیں ہیں۔ شفاف موتیوں کے دانے ہیں جو اس کی آنکھوں سے نکل کر نیچے زمین پر گرتے جاتے ہیں۔ جہاں ایک آدمی قرمزی رنگ کے غالیچے پر بیٹھا اطمینان سے انہیں چنتا جاتا ہے اور بولتا جاتا ہے ''بولو۔ بولو۔ دام لگاؤ، یہ کوئی معمولی شہزادی نہیں ہے، روتی ہے تو اس کی آنکھوں سے موتی گرتے ہیں۔ دیکھتے جاؤ اور دام لگاتے جاؤ۔''

''ایک لاکھ'' ایک آدمی نے گھبرا کر کہا۔

''دو لاکھ''۔ ''دس لاکھ''۔ ''چالیس لاکھ''

بولی بڑھ رہی تھی۔ موتی زمین پر گر رہے تھے۔

موہن نے کہا ''تم اس کی کیا بولی دو گے؟''

یوسف نے کہا ''میں تو ایک پیسہ بھی نہ دوں گا۔ مجھے تو روتی ہوئی شہزادی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔ مجھے ہنستی ہوئی شہزادی چاہیے۔''

موہن نے کہا ''مگر سوچو تو یہ موتیوں کی رانی ہے۔''

یوسف نے کہا ''پھر کیا ہوا؟ یہ بھی تو سوچو موتی حاصل کرنے کے لئے اسے ہر وقت رلانا پڑے گا۔ اسے طرح طرح کی تکلیفیں دینی پڑیں گی۔ تب کہیں یہ موتی ملیں

گے۔ میں تو اس ظلم کے لیے تیار نہیں ہوں۔

موہن نے کہا ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر اس بے چاری کو کسی نہ کسی طرح بچانا چاہیے۔''

یوسف نے کہا ''شہزادی تمہیں اچھی لگتی ہے۔''

موہن نے کہا ''میرے پاس ایک کہانیوں کی کتاب تھی۔ میرے باپ نے وہ کتاب چھین کے پھاڑ ڈالی۔ اس میں اسی شہزادی کی تصویر تھی۔''

یوسف کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے وہیں سے چلا کر کہا ''اے شہزادی اب ذرا ہنس کر تو دکھاؤ۔''

موتی چننے والا آدمی زور سے چلایا۔ ''خبردار جو ہنسی۔ جان سے مار دوں ڈالوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے زور سے شہزادی کی پیٹھ پر چابک لگایا۔ یوسف نے پھر زور سے کہا۔ ''اگر بکنا نہیں چاہتی ہو تو ہنسو، زور سے ہنسو۔ تکلیف ہو، درد بھی ہو، تو بھی ہنسو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

شہزادی نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ یکا یک اس کی آنکھوں سے موتی گرنا بند ہو گئے اور ہونٹوں سے پھول جھڑنے لگے۔ مگر یہ معمولی پھول تھے۔ جیسے گلاب، جوہی اور موگرے کے پھول۔ خریداروں کو ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نیلام کرنے والا دھڑا دھڑ چابک لگاتا گیا۔ پھر بھی شہزادی ہنستی گئی۔ خریدار گھبرا کے بھاگ گئے۔ کیونکہ وہ موتیوں کے خریدار تھے، پھولوں کے خریدار نہیں تھے۔

تھوڑی دیر میں چاروں طرف الو بولنے لگے۔ پھر نیلام کرنے والا بھی چابک مارتے مارتے خود بے ہوش ہو کر گر گیا۔ کیونکہ وہ پھولوں کی خوشبو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اس دن تک نہ پھول دیکھے تھے اور نہ پھولوں کی خوشبو سونگھی تھی۔ اس لیے وہ بے چارا بے ہوش ہو کر وہیں پھولوں کے انبار پر گر گیا۔ موہن اور یوسف نے آگے بڑھ کر شہزادی کی زنجیریں کھول ڈالیں۔ انھوں نے اسے چبوترے سے نیچے اتار ااور اسے اپنے ساتھ لے چلے۔

چلتے چلتے موہن نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شہزادی بہت ہنسی اور بولی ''تمہارے ہاتھ میں تو صرف ایک انگوٹھا ہے۔''

جونہی وہ ہنسی، اس کے ہونٹوں سے ایک ساتھ بہت سے پھول جھڑ پڑے۔ جہاں پھول جھڑ کر زمین پر گرے وہاں بہت سے پھولوں کے پودے اگ آئے۔ اس طرح جہاں جہاں سے شہزادی یوسف اور موہن گذرتے گئے اس لق و دق صحرا کو گلزار بناتے گئے۔ موہن کو چونکہ شہزادی مل گئی۔ اس لیے وہ بہت خوش تھا۔ یوسف سے کہنے لگا ''بھائی چلو واپس چلیں۔''

یوسف نے کہا ''ابھی اس جادو کی دنیا کی اور تھوڑی سی سیر کر لیں۔ چار آنے کا ٹکٹ لیا ہے۔ کوئی مفت تھوڑے ہی آئے ہیں دیکھو وہ سامنے کیا ہے؟''

جاری.....

اب مجھے یہ دولت لے کر چل دینا چاہیے...
دروازہ کھولنے کے لیے مجھے کیا کہنا ہے؟..
کھل جاٹم ٹم...نہیں..کھل جابم بم
لگتا ہے بھول گیا...
اف، ڈاکو آئے تو
مجھے مار ڈالیں گے
تبھی ڈاکو واپس آ پہنچے
گھوڑوں سے اترو
اور اندر چلو
ہائے! میں پھنس گیا
گھبرایا ہوا قاسم ڈر
سے ادھ مرا ہو چکا تھا
اوہ! قسم شیطان کی! یہ تو کوئی اجنبی
اندر آ گھسا ہے

بچوں کی دنیا

مار ڈالو اس احمق کو
لوٹ لو اسے
نہیں نہیں، چھوڑ دو،
رحم کرو
اس کے چار ٹکڑے کر کے
دروازے پر لٹکا دو تا کہ دوسروں
کو سبق ملے
اگلے دن...
آخر قاسم کہاں رہ گیا...خدا کرے وہ
ٹھیک ہو...مجھے خود دیکھنا چاہیے
اوہ!...قاسم میرے بھائی...
یہ کیا ہو گیا
مرجینا مصطفیٰ موچی کو گھر سے لے آئی
ہم چھوڑیں گے نہیں ان چالیس چوروں
کو...مرجینا، تم کسی موچی کو آنکھوں پر کپڑا
باندھ کر لاؤ تا کہ وہ قاسم کی لاش سی دے
جو حکم میرے آقا
جناب یہاں میں آنکھوں کی پٹی کھول دوں گی جس کے بعد
آپ کو ایک لاش کی سلائی کرنی ہے

آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے...اب آپ جائیں
لیکن خبردار کسی کو یہ نہ بتائیں کہ یہاں کیوں لایا گیا تھا
بعد میں...
مصطفیٰ موچی، مجھے یہ بتاؤ کہ چار ٹکڑوں والی لاش سینے کے لیے تک کس کے گھر گئے تھے
میں علی بابا کے گھر گیا تھا اس کے بھائی قاسم کی لاش سینے
علی بابا! ہم مم...یہ وہی ہونا چاہیے جو ہمارے خزانے کے غار کا راز جانتا ہے
علی بابا! تمھاری موت آچکی ہے، میں تمھارے گھر آرہا ہوں
چوروں کے سردار نے بھیس بدلا
اور علی بابا کے گھر کی طرف چل دیا
یہ رہا وہ گھر! اب اس بے وقوف علی بابا کو سبق سکھانا ہے

خدا آپ کا بھلا کرے، میں اکیلا ہوں، تھک چکا ہوں، کیا اس غریب تیل کے تاجر کو ایک رات پناہ ملے گی
غریب خانہ ہر ایک کی مدد کے لیے حاضر ہے
خوب! یہ چال ٹھیک جا رہی ہے...
اب مجھے نیند آرہی ہے مہربان، میں سونا چاہوں گا
ٹھیک ہے دوست، شب بخیر!
چلو پیچھا چھوٹا! اب باقی منصوبے پر دھیان دینا ہے
آخرکار ٹھیک جگہ آ گیا!
جب میں کھڑکی سے پتھر پھینکوں، تم لوگ پیپوں سے باہر آجانا!

Ali Baba And The Forty Thieves سے ماخوذ/ انگریزی سے ترجمہ: شبنم پروین

جاری...